شام کے سرمئی سائے رات کی سیاہیوں میں مدغم ہوتے جا رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی تاریکی جنگل کے اس حصے پر مسلط ہیبت اور پراسراریت میں اضافہ کرتی محسوس ہو رہی تھی۔

صبح سے جنگل کے طول و عرض میں بھٹکتے بھٹکتے گھوڑا ابھی تھک کے چور ہو چکا تھا اور گھوڑے پر سوار الباری قبیلے کا ترکمان سردار اسلم خان



گھوڑے کی پشت پر بیٹھا بیٹھا اکڑ سا گیا تھا۔ سو اس نے جھک کر گھوڑے کی ایال پر سر رکھ کر بازو گھوڑے کی گردن کے دونوں جانب ڈھیلے ڈھالے انداز میں ڈال دیے تھے۔

آج صبح دم اسلم خان اپنے دو ساتھیوں فہیم الدین اور نور خان کے ساتھ شکار کی غرض سے جنگل میں آیا تھا، پھر ایک ہرن کے تعاقب میں وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا۔ ہرن کے پیچھے گھوڑا اڑاتے وقت اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اس جنگل کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر اپنے ٹھکانے اور ساتھیوں سے بچھڑ جائے گا، ہرن تو کچھ ہی دیر میں قلانچیں بھرتا نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا اور وہ تب سے جنگل میں واپسی کا راستہ تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

شام ڈھلنے تک وہ تھکن سے چور ہو چکا تھا۔ گھوڑا بھی دن بھر کے بے مقصد اور لاحاصل سفر سے تھکان کا شکار تھا۔ سو اسلم خان نے گھوڑے کی گردن پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا تھا۔

اس عالم میں گھوڑا جانے کتنی دیر تک محوِ سفر رہا تھا تب ہی بالکل اچانک اسے گھوڑے کے رکنے کا احساس ہوا تھا۔ اس نے اسی طرح نیم دراز حالت میں آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا، گھوڑا نسبتاً ایک صاف ستھری پگڈنڈی پر کھڑا تھا اور سامنے ہی ذرا فاصلے پر ایک چھوٹی سی جھونپڑی دکھائی دے رہی تھی۔ جھونپڑی کے نیم شکستہ دروازے پر لٹکتے بوسیدہ ٹاٹ کے پردے سے دیے کی زرد روشنی باہر جھانک رہی تھی۔

اسلم خان ایک دم سے سیدھا ہو بیٹھا۔ اس جنگل بیابان میں روشنی سے مزین یہ جھونپڑی اس کیلئے حیرت اور تقویت کا باعث تھی۔ سو اس نے گھوڑے کی لگام کو قریبی درخت کی ایک نیچی شاخ سے باندھ کر جھونپڑی کا رخ کیا۔ قریب پہنچ کر اسے اندر سے کسی عورت کے رونے کی دھیمی سی آواز سنائی دی، ساتھ ہی ایک کمزور سی مردانہ آواز ابھری تھی۔

"نتاشا خانم میری بچی......! آخر تم اس طرح کیوں رو رہی ہو؟ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو، بے شک وہ زبردست مددگار ہے، وہ بھلا تمہیں اس ویرانے میں تنہا کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟"

اسلم خان کے قدم جہاں تھے، وہاں تھم گئے پھر کچھ سوچ کر اس نے پرانے ٹاٹ سے آراستہ سال خوردہ دروازے کے پہلو میں ایستادہ شہتیر پر دستک دی۔

دستک کی آواز ابھرتے ہی اندر سناٹا چھا گیا تھا۔

اسلم خان نے لحظہ بھر انتظار کے بعد دوبارہ دستک دی۔ اب کے فوراً ہی اندر سے ایک شخص کی نقاہت بھری آواز ابھری تھی۔ "کون......؟"

"میں ہوں اسلم خان!" اسلم خان نے اونچی آواز میں اپنا تعارف کروایا۔ "راستہ بھٹک کر میں اس طرف......!"

ابھی اسلم خان کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اندر موجود شخص نے مسرت آمیز آواز میں جواب دیا۔ "اوہ......! تو آپ آ گئے......؟ اندر تشریف لے آئیے۔"

اسلم خان اس کے جملے پر غور کرتا حیران حیران سا کٹیا کا پردہ اٹھاتا اندر چلا آیا۔ سامنے ہی پیال کے بستر پر ایک نحیف و نزار بوڑھا لیٹا ہوا تھا اور اس کے سرہانے گٹھڑی کی صورت سمٹی ہوئی سر جھکائے کوئی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسلم خان کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنی دبیز اوڑھنی کا کونا چہرے پر کھینچ کر گھونگھٹ سا کاڑھ لیا تھا۔

"بیماری اور نقاہت کے باعث میں آپ کے استقبال کیلئے اٹھ نہ سکوں گا۔" بوڑھے نے اسلم خان کے با آواز بلند سلام کے جواب میں اس کی سمت مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "پر آپ کی آمد پر میں دلی مسرت کے ساتھ آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔"

"آ...... آپ کون ہیں اور اس جنگل میں اس طرح......؟" اسلم خان نے بوڑھے کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے دھیمے اور حیران لہجے میں سوال کیا۔

"میرا نام احمد خویش ہے۔" بوڑھے نے اسلم خان کو اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "اور یہ میری اکلوتی بیٹی نتاشا خانم ہے۔" بوڑھے نے آنکھ کے اشارے سے سرہانے بیٹھی لڑکی کا تعارف کروایا اور دم بھر کو دم لینے کیلئے رک گیا۔

"میں صبح سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔" بوڑھے نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ نے آنے میں خاصی دیر لگا دی......؟"

"تعجب ہے۔" اسلم خان نے حیران نظروں سے بوڑھے احمد خویش کی طرف دیکھا۔ "بھلا آپ کو یہ کیونکر علم تھا کہ میں یہاں آنے والا ہوں؟"

"مجھے میرے رب کی طرف سے اشارہ مل گیا تھا۔" احمد خویش نے آنکھیں بند کرتے ہوئے مطمئن اور مشکور لہجے میں جواب دیا۔ "آپ کو میرے مہربان رب نے ایک خاص مقصد کیلئے یہاں بھیجا ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" اسلم خان نے الجھن بھرے لہجے میں کہا۔ "بھلا ایسا کونسا مقصد ہو سکتا ہے؟"

"میں بتاتا ہوں۔" بوڑھا اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ "لیکن...... اصل مقصد کی طرف آنے سے پہلے میں اپنے بارے میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

چند ساعتوں کی خاموشی کے بعد بیمار اور زرد رو احمد خویش نے نیم وا آنکھوں سے اسلم خان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات کا آغاز کیا۔

"جنگل کی داہنی جانب ذرا فاصلے پر جو بستی ہے، سترہ سال پہلے میں اسی بستی میں رہتا تھا، میرا ایک پرسکون گھر تھا اور محبت کرنے والی نیک اور دیندار بیوی تھی، ہماری کوئی اولاد نہ تھی، اس کے باوجود ہم دونوں باہم بے حد خوش اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے، شادی کے تیرہ سال بعد وہ پہلی بار امید سے ہوئی تو ہماری خوشی دیدنی تھی مگر یہ خوشی پائیدار ثابت نہ ہوئی، بیٹی کی پیدائش کے دوران میری بیوی کا انتقال ہو گیا۔" احمد خویش کی دھنسی ہوئی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ پھر گویا ہوا۔

"بیوی کی موت کے بعد میرا دل گھر اور بستی سے اچاٹ ہو گیا اور میں اپنی اس بچی کو......!" بوڑھے نے آنکھ سے سرہانے کی جانب آنچل میں چہرہ چھپائے سر نہوڑائے بیٹھی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جو اس وقت صرف ڈھائی مہینے کی تھی، اپنے ساتھ لے کر اس جنگل میں چلا آیا...... یہاں آ کر میں نے یہ کٹیا بنائی اور مالکِ حقیقی کی عبادت اور ریاضت میں مصروف ہو گیا...... رازقِ برحق میرے اور میری بچی کے رزق کا بندوبست کرتا رہا اور آہستہ روی کے ساتھ وقت گزرتا گیا، یہاں تک کہ بڑھاپے اور بیماری نے مجھے گھیر لیا۔"

بوڑھے نے گہری سانس لے کر اسلم خان کی طرف دیکھا جو نہایت توجہ اور انہماک سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔" بوڑھے احمد خویش نے بات آگے بڑھائی۔ "سو میں بھی جان، جان آفریں کے سپرد کرنے کیلئے آمادہ و تیار ہوں۔ پر میں اپنی اس معصوم اور نیک طینت بیٹی کے مستقبل کی طرف سے متفکر تھا...... تب...... آج صبح طلوعِ فجر کے ساتھ میرے

رب کی طرف سے مجھے اشارہ ملا کہ آج اس جھونپڑی میں وہ شخص پہنچنے والا ہے جو میری بیٹی نتاشا خانم کا نجات دہندہ ثابت ہو گا...... سو اسی وقت سے میں آپ کی راہ دیکھ رہا ہوں۔"

"اوہ......!" اسلم خان نے قدرے تذبذب کے ساتھ بوڑھے کے نورانی چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی نیم وا آنکھوں میں امید، یقین بن کر لرز رہی تھی۔

"اسلم خان! کیا آپ کو خدا کا یہ فیصلہ منظور ہے؟" بوڑھے نے مضبوط لہجے میں اسلم خان سے سوال کیا۔ "میں اپنی سترہ سالہ بیٹی نتاشا خانم کا عقد آپ کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں...... آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"جج...... جی...... وہ......!" اسلم خان اس غیر متوقع سوال پر کسی قدر گڑبڑا گیا تھا کیونکہ وہ نہ صرف شادی شدہ تھا بلکہ دو جواں سال بیٹوں ضیغم خان اور معزالدین کا باپ بھی تھا، اس کی بیوی ورقہ بانو بارہ بھائیوں کی اکلوتی بہن، ایک غصیلی، تیز مزاج اور بدزبان عورت تھی۔ دوسرے بیٹے معزالدین کی پیدائش کے وقت کچھ پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں جس کے باعث وہ پھر سے ماں بننے کے وصف سے محروم ہو گئی تھی۔ ورقہ بانو کے اس نقص کے باعث اسلم خان کی ماں شاہ دریغ اور اس کے احباب اور بہی خواہ اکثر اسے دوسری شادی کیلئے اکساتے رہتے تھے تاکہ وہ مزید اولاد کی دولت سے بہرہ ور ہو سکے مگر اسلم خان نیک طینت اور صلح جو فطرت کا مالک تھا، بیوی کے غصے اور شور شرابے کے ڈر سے اس نے پہلے کبھی دوسری شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا مگر اس وقت کی صورتحال یکسر مختلف تھی۔ فرشتہ صورت بوڑھا احمد خویش خدا کی منشا اور اپنی خواہش کا اظہار کرنے کے بعد سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شادی کے اس فیصلے میں منشائے ایزدی شامل تھی۔ سو وہ انکار کی جسارت کس طرح کر سکتا تھا۔

"جی......!" اس نے گلا صاف کر کے نسبتاً اونچی اور واضح آواز میں جواب دیا۔ "اگر رب العالمین کی یہی رضا ہے تو میں اس کی رضا میں راضی ہوں، میں آپ کی صاحبزادی سے عقد کیلئے آمادہ ہوں، آپ یہ نیک کام جب چاہیں کر سکتے ہیں۔"

"بہت شکریہ۔" بوڑھے نے تشکر بھری نظروں سے اسلم خان کے مضبوط اور توانا سراپے کی طرف دیکھا۔ "مگر ہمیں ابھی کچھ دیر اور انتظار کرنا پڑے گا۔"

اس نے منتظر نظروں سے جھونپڑی کے نیم وا دروازے کی طرف دیکھا۔ تب ہی جھونپڑی کے باہر پگڈنڈی پر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز ابھرتی محسوس ہوئی تھی۔

"لیجئے، اس مسبب الاسباب نے گواہوں کو بھی بھیج دیا۔" بوڑھے کی مسرور آواز ابھری۔

"گواہ......؟" اسلم خان نے حیران اور سوالیہ نظروں سے بوڑھے کی طرف دیکھا۔

"جی۔" احمد خویش نے اثبات میں سر ہلایا۔ "عقد کیلئے گواہوں کا ہونا بھی ضروری ہے، سو اس باری تعالیٰ نے گواہ بھیج دیے۔"

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

"سردار اسلم خان! کیا آپ اندر موجود ہیں؟" اسلم خان کی سماعت سے اس کے ساتھی نور خان کی آواز ٹکرائی۔ "باہر موجود آپ کے گھوڑے کو دیکھ کر ہمیں یہ گمان گزرا کہ شاید آپ......؟"

"جی! اسلم خان اندر موجود ہیں۔" اسلم خان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی احمد خویش نے اونچی اور واضح آواز میں جواب دیا۔ "آپ دونوں اندر تشریف لے آئیے۔"

اور اگلے ہی لمحے فہیم الدین اور نور خان حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھتے اندر داخل ہو گئے تھے۔

"آپ کو کیسے علم ہوا کہ ہم دو ہیں؟" فہیم الدین نے حیران لہجے میں احمد خویش سے سوال کیا۔

"کیونکہ مجھے، اپنی بیٹی اور اسلم خان کے عقد کیلئے دو گواہوں کا انتظار تھا۔" بوڑھے کے باریک خشک لبوں پر تبسم کی لو ٹمٹمائی اور اس کا نحیف و کمزور چہرہ روشن ہو گیا۔ "اسی لئے مجھے یقین تھا کہ آنے والے دو ہی ہوں گے۔"

پھر چشمِ زدن میں سب کچھ ہو گیا تھا۔

بوڑھے احمد خویش نے اسلم خان کے دونوں ساتھیوں فہیم الدین اور نور خان کی موجودگی میں اپنی بیٹی نتاشا خانم کا عقد اسلم خان سے پڑھا دیا تھا، پھر نتاشا خانم کا نرم و نازک ہاتھ اسلم خان کے مضبوط اور توانا ہاتھ میں دے کر اس نے بشاش لہجے میں کہا۔

"میں اب ربِ کریم و عظیم کا شکرگزار ہوں کہ اس نے میری بیٹی کیلئے ایک اچھے اور قابلِ احترام و دیندار شخص کا انتخاب کیا۔" پھر وہ اپنی بیٹی کو مخاطب کر کے بولا۔ "جس کی معیت میں تم ہمیشہ محفوظ و مامون اور خوشحال زندگی بسر کرو گی...... خداوند رحیم تمہیں ایک حسین و جمیل اور نیک صالح فرزند عطا کرے...... اس دعا کے علاوہ تمہیں دینے کیلئے تمہارے اس غریب باپ کے پاس اور کچھ نہیں ہے۔"

پھر وہ اسلم خان کی طرف متوجہ ہوا۔

"اس احسان کیلئے میں آپ کا ممنون ہوں اور مزید ایک احسان کا متمنی ہوں۔"

"جی فرمائیے۔" اسلم خان، احمد خویش پر جھکتے ہوئے جلدی سے بولا۔ چند لمحوں تک بیٹھنے اور مسلسل بولتے رہنے کے باعث اس کی نقاہت میں اضافہ ہو گیا تھا سو اسلم خان نے اسے دوبارہ بستر پر لٹا دیا تھا۔

"کفن موجود ہے۔" بوڑھے نے چند لمحوں تک گہری گہری سانسیں لینے کے بعد کہا۔ "بعد از مرگ مجھے اسی کٹیا میں دفن کیا جائے اور آپ میری نمازِ جنازہ ادا کریں۔"

یہ کہہ کر احمد خویش نے آنکھیں بند کر کے کلمۂ طیبہ پڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

اسلم خان نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اسے غسلِ آخر دیا تھا اور نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے بعد اسے بصد احترام سپردِ خاک کر کے اس کی بیٹی نتاشا خانم جو اب اسلم خان کی منکوحہ تھی، کو ساتھ لے کر گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

نتاشا خانم، اسلم خان کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھی ہوئی تھی، جبکہ اس کے دونوں ساتھی فہیم الدین اور نور خان تھوڑا فاصلہ رکھ کر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"فہیم الدین! میری خواہش ہے کہ تم تیز رفتاری سے حویلی پہنچ کر یہ خبر کسی خادمہ کے ذریعے والدہ گرامی اور زوجہ محترمہ تک پہنچا دو تاکہ وہ ذہنی طور پر اس واقعے کیلئے تیار ہو جائیں۔"

"جی بہتر۔" فہیم الدین نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے جواب دیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

"آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب......؟" تیز طرار نوجوان خادمہ فضا ساری بات سننے کے بعد کچھ بھی سمجھ نہ سکی تھی۔ "سردار اسلم خان نے دوسری شادی کر لی؟ مگر کیسے...... کب......؟ وہ تو شکار کی غرض سے کل صبح ہی تو گھر سے روانہ ہوئے تھے...... بھلا چوبیس گھنٹوں میں یہ سب......!"

"اس مسئلے پر غور کرنے کی تمہیں ضرورت نہیں ہے۔" خادمہ کے سوال و جواب سے بیزار ہو کر فہیم الدین نے کہا۔ "بس تم سے جو کہا جا رہا ہے، اس پر عمل کرو...... اور فوراً جا کر سردار کی والدہ اور زوجہ ورقہ بانو کو اطلاع دے دو۔"

فہیم الدین کی سنجیدگی اور کسی قدر خفگی کو محسوس کرتے ہوئے خادمہ کو مزید کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی اور وہ تیزی سے ورقہ بانو کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔

"خانم! غضب ہو گیا۔" خادمہ نے خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی فریادی لہجے میں دہائی دی۔ "سردار شکار کرنے گئے تھے مگر نصیبِ دشمناں خود شکار ہو گئے۔"

"کیا بکتی ہے؟" ورقہ بانو نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔ "جلد بتا سردار خیریت سے تو ہیں؟"

"وہ تو خیریت سے ہیں مگر آپ کیلئے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔" خادمہ نے لحہ بھر کو رک کر ورقہ بانو کے سرخ و سفید چہرے کی طرف دیکھا۔ "ابھی ابھی فہیم الدین نے یہ اطلاع دی ہے کہ سردار نئی نویلی دلہن کے ساتھ حویلی پہنچنے والے ہیں۔"

"تیرے منہ میں خاک......!" ورقہ بانو نے تڑپ کر جواب دیا۔ "جو منہ میں آتا ہے، بک دیتی ہے...... جانتی بھی ہے کیا کہہ رہی ہے؟"

"آپ یقین کریں...... ایسا ہو چکا ہے۔" خادمہ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "فہیم الدین نے نہایت سنجیدگی سے یہ خبر دی ہے اور مجھے تاکید کی ہے کہ یہ خبر میں سردار کی والدہ محترمہ کو بھی دے دوں۔"

74 سالہ بوڑھی شاہ دریغ نے یہ خبر سنی تو ساری بات سن کر بڑے اطمینان کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اگر میرے بیٹے اسلم خان نے ایسا کوئی قدم اٹھایا ہے تو یقیناً اس میں مصلحتِ خداوندی ہو گی...... میں آنے والی بہو کا خوش دلی سے استقبال کیلئے تیار ہوں۔"

"تمہاری دادی ہمیشہ سے یہی چاہتی تھی کہ تمہارا باپ دوسری شادی کر لے۔" یقین نہ کرنے کے باوجود ورقہ بانو نے واویلا شروع کر دیا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے اس کے گرد جمع ہو گئے تھے اور ماں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"بتاؤ ذرا! بیٹوں کی شادی کی عمریں آ گئی ہیں اور وہ خود اپنا بیاہ رچا کر بیٹھ گیا ہے۔"

تب ہی اسلم خان، نتاشا خانم کے ساتھ آ پہنچا۔

یہ منظر ورقہ بانو کیلئے کسی سانحہ سے کم نہ تھا۔ اس نے بال بکھرا لئے اور سینہ کوبی شروع کر دی تھی۔

"ورقہ خانم! خود کو سنبھالو...... بلاوجہ کا تماشا بنانے سے کیا فائدہ......؟" اسلم خان نے دھیمے لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تم اسی وقت اس نابکار کو طلاق دے کر روانہ کرو ورنہ......!" اس نے اسلم خان کے پہلو میں کھڑی سمٹی اور سہمی ہوئی نتاشا خانم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ابھی تک اسلم خان نے اس کا چہرہ بھی نہ دیکھا تھا، اس کا چہرہ دبیز گھونگھٹ کی قید سے آزاد ہی نہیں ہوا تھا۔

"ورنہ......؟" اسلم خان نے بھنویں سکیڑ کر گمبھیر لہجے میں سوال کیا۔

"ورنہ...... میں ابھی اپنے بیٹوں کو لے کر اپنے بھائیوں کے گھر چلی جاؤں گی۔" ورقہ بانو دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔

"دوسری شادی کرنا کوئی ایسی انہونی اور انوکھی بات تو نہیں ہے۔" اسلم خان نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "اس کے باوجود تم جانتی ہو میں کبھی دوسری شادی کرنے کا خواہشمند نہیں رہا اور یوں جو اچانک میں اس عقد کیلئے آمادہ ہوا تو یہ ایک الگ داستان ہے، تم ذرا میرے پاس بیٹھ کر صبر سے ساری بات سنو تو تمہاری سمجھ میں خود یہ تمام بات آ جائے گی۔"

"دوسری شادی کوئی گناہ نہیں ہے۔" اسلم خان کی ماں شاہ دریغ تیزی سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "خود اس کے ہر بھائی کی کم از کم تین، تین بیویاں ہیں اور اگر میرے بیٹے نے دوسرا عقد کر لیا تو ایسی کون سی قیامت آ گئی؟"

پھر وہ تیزی سے نتاشا خانم کے قریب آ گئی اور اس کا گھونگھٹ الٹ دیا۔

ایک دم سے کمرے کی نیم تاریک فضا میں اجالا سا پھیل گیا تھا۔ جو نگاہ بھی اس کی جانب اٹھی، ٹھٹھک کر وہیں جم گئی۔

"ماشاءاللہ!" شاہ دریغ نے نئی بہو کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ "تم حسین ہی نہیں بلکہ ایک بخت آور، دیندار اور نیک عورت دکھائی دیتی ہو، نئی زندگی تمہیں مبارک ہو۔" پھر شاہ دریغ نے خادمہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "فضا! تم دلہن کو اسلم خان کے کمرے میں لے جاؤ اور ان لوگوں کے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔" اس کے بعد وہ ورقہ بانو کی طرف متوجہ ہوئی۔ "اور اگر تم اپنے بھائیوں کے گھر جانا چاہتی ہو تو شوق سے جاؤ مگر یاد رکھو تمہیں اکیلے جانا ہو گا...... میرے پوتے اپنے گھر میں اپنے باپ کے زیرِ سایہ رہیں گے۔" پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ "میری مانو، پہلے پوری بات سن لو پھر کوئی فیصلہ کرنا۔"

اسلم خان سامنے بچھے تخت پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے سر جھکا کے آہستگی سے ساری کہانی کہہ سنائی پھر وہ بولا۔ "اب تم ہی کہو، اس میں خدا کی منشا تھی یا میری خواہش......؟" اسلم خان نے ساری بات سنا کر سوالیہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ "اگر یہ سب سننے کے بعد بھی تمہیں مجھ پر غصہ ہے تو تم اپنے بھائیوں کے گھر جا سکتی ہو...... میں تمہیں نہیں روکوں گا۔"

ورقہ بانو سوچ میں ڈوب گئی۔ وہ جانتی تھی گھر چھوڑ کر جانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ ویسے بھی اسلم خان نے کوئی جرم نہیں کیا تھا، سو اس نے حالات سے سمجھوتہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے دونوں بیٹے اٹھارہ سالہ ضیغم خان اور تیرہ سالہ معزالدین بھی باپ کے اس اقدام پر خوش نہیں تھے مگر انہوں نے زبان کھولنے سے گریز کیا تھا۔

نتاشا خانم نے چند ہی دنوں میں نہ صرف اپنی ساس شاہ دریغ بلکہ حویلی میں موجود ہر چھوٹے بڑے کا دل جیت لیا تھا اور جہاں تک اسلم خان کا تعلق تھا، وہ خدا کی طرف سے عطا کردہ اس نایاب انعام کو پا کر اس کا بے حد شکرگزار تھا۔ نتاشا خانم ایک حسین و جمیل، سلیقہ مند، خدمت گزار اور دیندار عورت تھی، ایک دیندار اور عبادت گزار باپ نے اس کی تعلیم و تربیت میں کسی طرح کا فروگزاشت روا نہ رکھا تھا، وہ حافظِ قرآن ہونے کے ساتھ تہجد گزار اور انتہائی نیک طینت اور پاکیزہ فطرت کی مالک تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے حسنِ اخلاق اور حسنِ سلوک سے ہر شخص کے دل میں گھر کر لیا مگر باوجود شدید خواہش اور کوشش کے وہ اب تک اپنی سوت ورقہ بانو اور اس کے بیٹوں ضیغم خان اور معزالدین کی نظروں میں اپنے لئے کوئی مقام نہ بنا سکی تھی۔ وہ تینوں روزِ اول کی طرح آج بھی اس سے نفرت کرتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال بیت گیا۔

نتاشا خانم ماں بننے والی تھی۔

اسلم خان، اپنے چھوٹے بیٹے معزالدین کی ولادت کے پورے چودہ سال بعد دوبارہ باپ بننے جا رہا تھا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔

دور مشرق کی جانب قرمزی پہاڑیوں کی اوٹ سے نارنجی کرنوں نے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا اور نیلگوں آکاش دیکھتے ہی دیکھتے گلگوں ہو گیا تھا، اپنی مترنم و مدھر آوازوں میں باری تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے خوش رنگ و خوش گلو پرندے آشیانوں سے نکل کر فضائے بسیط میں آغازِ پرواز کر چکے تھے، بادِ سحر کے نرم جھونکوں میں نوخیز اور نوشگفتہ غنچوں کی مہکار رچی ہوئی تھی۔

42 سالہ ترکمان سردار اسلم خان اس وقت اپنے احباب اور مصاحبین کے ساتھ نشست گاہ میں موجود تھا۔ پورے کمرے میں زمین پر خوش رنگ و خوشنما مخملیں قالین بچھے تھے، دیوار کے ساتھ ساتھ نرم اور گاؤ تکیے دھرے تھے، جن سے ٹیک لگائے اس کے دونوں نوجوان بیٹے ضیغم خان اور معزالدین بیٹھے تھے۔ بڑے بیٹے ضیغم خان کی مسیں بھیگنے لگی تھیں، دونوں کے گورے چٹے، صحت مند چہروں پر ایک عجب سی درشتگی اور سختی پائی جاتی تھی۔ اس وقت ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں اور ان سے ناگواری اور خفگی جھانک رہی تھی۔

سردار اسلم خان کبھی گاؤ تکیے سے کمر ٹکا کر بیٹھ جاتا اور کبھی اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ اس کے باوقار و وجیہہ چہرے پر ایک اضطراب اور اشتیاق کا امتزاج لئے انتظار کا احساس بکھرا ہوا تھا۔ اس کے احباب و مصاحب بھی منتظر نظروں سے نیم وا دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ترکی طرزِ تعمیر کی حامل اس کشادہ حویلی کے اندرونی کمروں میں سے ایک کمرے میں نتاشا خانم تخلیق کے کربناک عمل سے گزر رہی تھی۔ اس وقت اس کی کشادہ صندلی پیشانی عرق آلود تھی، کلیوں کے سے گلابی لب، موتیوں کے سے دمکتے دانتوں تلے دبے ہوئے تھے، دو ماہر اور عمر رسیدہ دائیاں اور چند خادمائیں مستعدی سے اس کے اطراف موجود تھیں۔

کچھ فاصلے پر بچھے مخملی غالیچے پر اس کی ساس شاہ دریغ اور سوت ورقہ بانو لاتعلق سی بیٹھی تھیں۔ ورقہ بانو ایک ادھیڑ عمر اور دہرے جسم کی سرخ و سفید عورت تھی، اس کی آنکھوں سے ترشی اور نخوت اور چہرے سے عیاری ٹپکتی تھی۔

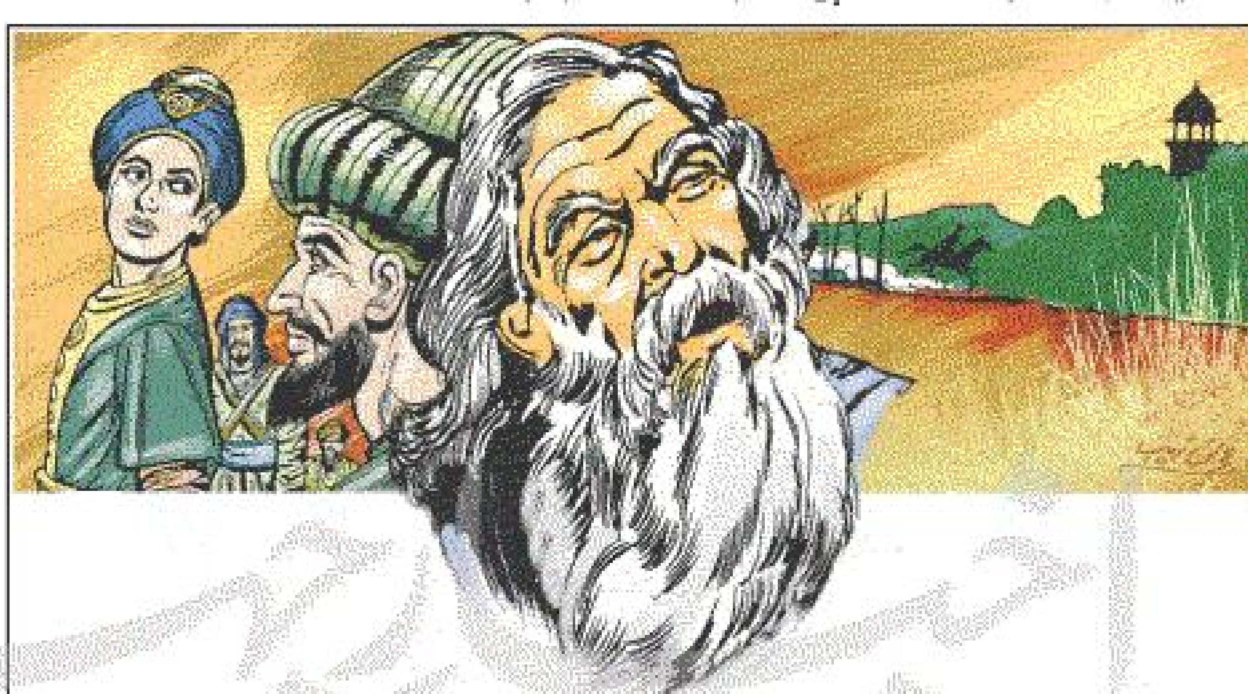
"اف......!" نتاشا خانم کو اپنے وجود میں درد کی ایک شدید لہر سی اٹھتی محسوس ہوئی تو اس نے قریب کھڑی دایا کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے سرد ہاتھ میں جکڑ لیا تھا۔

"چند لمحوں کی بات ہے۔" اسلم خان کی بوڑھی مگر صحت مند ماں شاہ دریغ بہو کے قریب اٹھ آئی تھی۔ "پھر میرا پوتا تمہاری آغوش میں ہو گا۔" شاہ دریغ نے نرم اور حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔

''خدا کرے بیٹی پیدا ہو۔'' ساس کی بات سن کر ورقہ بانو نے دل میں جل کر سوچا تھا۔

ادھر نشست گاہ میں بھی یہی موضوع زیرِ بحث تھا۔

''دو ہونہار بیٹوں کے بعد کیا اب آپ ایک خوش اطوار بیٹی کی آرزو رکھتے ہیں؟'' ایک مصاحب نے ماحول میں پھیلے تناؤ کو کم کرنے کی



خاطر دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''جیسا تم جانتے ہو۔'' اسلم خان نے مصاحب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ میری دوسری بیوی کی پہلی اولاد ہے اور انسان پہلی اولاد کیلئے ہمیشہ ہی بیٹے کی آرزو کرتا ہے...... ویسے بھی میرے مرحوم خسر احمد خویش کی یہ دعا تھی کہ اللہ ہمیں ایک خوش رو اور خوش بخت فرزند عطا کرے۔''

اس کے دونوں نوجوان بیٹوں کے چہروں سے ناراضی اور ناگواری ٹپکنے لگی تھی۔ اول تو وہ اپنے ادھیڑ عمر باپ کی ایک نوخیز اور حسین لڑکی سے شادی سے ناخوش تھے، دوم سال نہیں گزرا تھا کہ اب وہ ماں بننے جارہی تھی۔

وہ دونوں اپنے باپ کی زبان سے یہ سننے کے متمنی تھے کہ ''میرے پاس پہاڑ جیسے مضبوط اور شیر جیسے بہادر بیٹے موجود ہیں، اب بے شک ایک پھول سی نرم و نازک بیٹی پیدا ہو۔''

مگر اس کے برعکس وہ بیٹے کی آرزو رکھتا تھا۔

نئی بیوی لانے کے بعد ان کا باپ ان کی ماں کی طرف سے خاصا لاپروا ہوگیا تھا۔ نئے بیٹے کی ولادت کے بعد ان دونوں کا بھی یہی حشر ہونے والا تھا۔ اس تصور سے بھی انہیں آنے والے بچے سے شدید نفرت محسوس ہورہی تھی اور ان کے چہروں پر بکھری خشونت کچھ اور گہری ہوچلی تھی۔

تب ہی حویلی کے اندرونی کمروں میں سے کسی بند دروازے کے اس پار سے کسی نومولود کی رونے کی آواز جل ترنگ کے مترنم ساز کی طرح حویلی کی خالی راہداریوں سے سفر کرتی اس بیٹھک تک آپہنچی تھی۔

''مبارک ہو سردار......!'' نور خان نے مسرت بھرے پرجوش لہجے میں اسلم خان کو مبارکباد پیش کی تھی۔ اسلم خان کی اشتیاق بھری نظریں ہنوز دروازے پر لگی تھیں۔ جہاں سے ایک خادمہ اندر داخل ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

''مبارک ہو سردار! خدا نے آپ کو ایک صحت مند اور خوبصورت فرزند عطا کیا ہے۔'' خادمہ نے ادب سے جھک کر خوشی سے لبریز آواز میں خوشخبری دی۔ ''اس کی آنکھیں تاروں کی طرح دمکتی ہوئی اور چہرہ آفتاب جیسا روشن اور تابناک ہے۔''

اسلم خان کا صحت مند گلابی چہرہ فرطِ مسرت اور دبے دبے جوش سے تمتمارہا تھا جبکہ اس کے دونوں بیٹوں کے چہرے دھواں دھواں ہوگئے تھے۔ نفرت، غصہ، ناپسندیدگی اور ناگواری ان کی مچی ہوئی تنی آنکھوں سے مترشح تھی۔

''کیا میں اپنے لختِ جگر کو دیکھ سکتا ہوں؟'' اسلم خان نے پراشتیاق لہجے میں خادمہ سے پوچھا۔

''کیوں نہیں!'' خادمہ نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''ابھی کچھ ہی دیر میں خانم کو ان کی خواب گاہ میں منتقل کردیا جائے گا...... وہاں آپ زچہ و بچہ دونوں کو ملاحظہ فرماسکیں گے۔''

اپنے کام میں ماہر اور مشاق دائیاں کچھ ہی دیر میں ولادت کے بعد کے تمام امور سے فارغ ہوچکی تھیں۔ تناشا خانم کو اس کے صاف ستھرے آرام دہ کمرے میں منتقل کردیا گیا تھا، چند ہی لمحوں بعد ایک خادمہ نے نومولود کو نہلا کر ایک ریشمی چادر میں لپیٹ کر ماں کے پہلو میں لالٹایا تھا۔

''کوئی جاکر اسلم خان کو بلا لائے۔'' اسلم خان کی ماں شاہ دریغ نے محبت پاش نظروں سے اپنے نوزائیدہ پوتے کی طرف دیکھتے ہوئے قریب کھڑی خادماؤں کو حکم دیا۔ ''تاکہ وہ اپنے فرزند کے کان میں اذان دے سکے۔''

''سردار خود ہی اپنے لختِ جگر اور نورِ نظر کو دیکھنے کیلئے تشریف لارہے ہیں۔'' شاہ دریغ کی بات کے اختتام سے پہلے ایک خادمہ نے کمرے میں داخل ہوکر اطلاع دی۔

تناشا خانم کے نوجوان اور دلکش چہرے پر ہلکی سی زردی پھیلی ہوئی تھی۔ خادمہ کی بات سنتے ہی اس پر کئی رنگ بکھر گئے تھے، اس نے مسرت و انبساط سے لبریز فخریہ نظروں سے اپنے پہلو میں لیٹے نومولود کی طرف دیکھا۔ اس کا دلکش و معصوم چہرہ ماہِ کامل کی طرح جگمگا رہا تھا۔

تناشا خانم کو اس کے شوہر سردار اسلم خان نے اس ایک سالہ ازدواجی زندگی میں عزت و احترام اور خلوص و محبت کی بے تحاشا دولت سے نوازا تھا۔ گوکہ تناشا ایک سادہ اور پاکیزہ زندگی گزارنے کی عادی تھی اور سادگی کو بے حد پسند کرتی تھی، اس کے باوجود اسلم خان نے اس کیلئے ریشم، اطلس اور کمخواب کے ملبوسات اور جواہرات سے مزین طلائی زیورات کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔ ان تمام عنایات اور نوازشات کے جواب میں آج وہ اپنے چاہنے والے قابلِ احترام شوہر کی خدمت میں یہ چاند سا بیٹا پیش کرنے والی تھی، اس کے بے شمار بیش قیمت تحائف کے جواب میں آج وہ اس کے حضور یہ نادر و نایاب سوغات پیش کرنے والی تھی۔

اسلم خان کمرے میں داخل ہونے سے قبل لحظہ بھر کو دروازے پر ٹھہرا تھا پھر اگلے ہی لمحے باوقار انداز میں سر اٹھائے پورے استحقاق کے ساتھ کمرے میں داخل ہوگیا تھا۔ پہلے اس کی نگاہ تناشا کے چہرے پر گئی تھی گوکہ اس کے چہرے پر ہلدی سی گھنڈی ہوئی تھی، پھر بھی مسرت و حیا کے ملے جلے احساس سے اس کے رخسار تمتمارہے تھے۔

شوہر سے نگاہ ملتے ہی اس نے دھیمی مگر مسرت سے لبریز آواز میں کہا۔ ''خان...... ! مبارک ہو، آپ ایک اور بیٹے کے باپ بن گئے ہیں۔''

اسلم خان اس کی بات سن کر مسکراتا ہوا بیٹے کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھتا، اس کی ماں شاہ دریغ نے رواج کے مطابق لپک کر نومولود کو اپنی گود میں اٹھا کر اس کا چہرہ چادر میں چھپا دیا تھا۔

''ماں......! بچہ مجھے دیجئے تاکہ میں اس کے کان میں اذان دے سکوں۔'' اسلم خان نے شرمیلی نظروں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں گزارش کی۔

''تم مجھے اپنے خزانے میں سے بیش بہا ہیرا دینے کا وعدہ کرو تو پھر میں تمہیں تمہارے لعل کا چہرہ دیکھنے کا موقع دوں گی۔'' شاہ دریغ نے مسکراتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔

''ایک ہیرا کیا، پورا خزانہ آپ کے قدموں پر نثار۔'' اسلم خان خوشامدانہ لہجے میں کہتا آگے بڑھا اور بے تاب آواز میں بولا۔ ''مادرِ محترمہ! للہ مجھے اس چاند کا چہرہ دیکھنے دیجئے۔''

شاہ دریغ نے بچے کے چہرے سے چادر کا کونہ ہٹا دیا۔ کمرے کی نیم تاریک فضا یکایک جگمگا اٹھی تھی۔ اسلم خان نے حیرت اور مسرت بھری نظروں سے بچے کی طرف دیکھا۔

بچے کا درخشاں چہرہ مہرِ نیم روز کی طرح تابندہ تھا۔ ماہتاب کی سی دمکتی کشادہ پیشانی اس کی بلند بختی کی دلیل تھی، گھنی پلکوں سے سجی بڑی بڑی سیاہ خمار آلود آنکھوں سے ذہانت و فطانت کا اظہار ہورہا تھا۔ وہ ایک حسین و جمیل اور ذہین و فطین بچہ دکھائی دے رہا تھا۔ اسلم خان کا دل فرطِ مسرت سے دھڑکنے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر بے ساختہ بچے کو گود میں لے کر سینے سے لگا لیا۔

ذرا فاصلے پر کھڑی ورقہ بانو یہ سب سلگتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اپنی ساس شاہ دریغ کی خوشی اپنی سوتن تناشا خانم کی آنکھوں سے مترشح مسرت اور اپنے شوہر اسلم خان کی دیوانگی دیکھ کر وہ دل ہی دل میں جھلس رہی تھی۔

بچے کے کانوں میں اذان دینے کے بعد اسلم خان نے اسے تناشا خانم کے پہلو میں لٹاتے ہوئے اپنی ماں شاہ دریغ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مادرِ عزیزہ! میں نے اس روشن چہرے اور دمکتی آنکھوں والے بچے کا نام شمس الدین تجویز کیا ہے...... آپ کیا فرماتی ہیں؟''

''بہت خوب۔'' شاہ دریغ نے مسرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ''میری دعا ہے کہ سورج کی روشن کرنوں کی طرح اس کی شہرت و عزت بھی پورے عالم میں پھیل جائے۔''

''آمین......!'' اسلم خان نے مسرت بھری آواز میں کہا پھر سوالیہ نظروں سے تناشا خانم کی طرف دیکھا۔ ''بیگم! آپ کیا کہتی ہیں؟''

''بہت مناسب اور خوبصورت نام ہے۔'' تناشا نے دھیمی مگر مسرور آواز میں جواب دیا۔ ''خدا کرے یہ آپ کی امیدوں پر پورا اترے۔''

تناشا خانم جانتی تھی اسلم خان اپنے دونوں بڑے بیٹوں سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھا، ان کی ماں ورقہ بانو کی تربیت نے انہیں نکما، غصیلی، جھگڑالو اور حاسد بنا دیا تھا جبکہ اسلم خان کو اپنی جاگیر اور قبیلے کی سرداری کیلئے ایک نیک صالح، باکردار اور منصف مزاج جانشین کی ضرورت تھی اور ننھے شمس الدین کو دیکھ کر اسے یقین ہو چلا تھا کہ جلد ہی اس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکے گا۔

''بیگم! آپ خوش ہیں نا؟'' اسلم خان پیار بھرے لہجے میں تناشا خانم سے پوچھ رہا تھا۔

''اگر آپ خوش ہیں تو میں بھی بے حد خوش ہوں۔'' تناشا نے شرمیلے لہجے میں جواب دیا۔

''خان...... ! بیٹا مبارک ہو۔'' ورقہ بانو نے آگے بڑھ کر رسمی انداز میں مبارکباد دی۔

''تمہیں بھی مبارک ہو۔'' اسلم خان نے لحظہ بھر کو پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ سرسری سے لہجے میں جواب دیا اور دوبارہ تناشا خانم کی طرف متوجہ ہوگیا۔

ورقہ بانو کا دل جل کر کباب ہوگیا تھا۔ وہ غصیلے انداز میں پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی تھی جہاں اس کے دونوں بیٹے پہلے سے ہی منہ پھلائے بیٹھے تھے۔

''ایسا لگ رہا ہے کہ اس سے پہلے قبیلے میں کسی عورت نے بیٹا جنا ہی نہ ہو۔'' وہ دل جلے انداز میں بولی۔ ''انوکھا بیٹا پیدا کیا ہے اس نے اور اس پر تمہاری دادی کے چہرے سے پھوٹتی خوشی تم دیکھتے؟''

''خوشی تو پدرِ گرامی کے پور پور سے ہی پھوٹی پڑ رہی تھی۔'' بڑے بیٹے ضیغم خان نے سلگتے لہجے میں بتایا۔ ''ہم جیسے جواں اور تنومند بیٹوں کی موجودگی میں نومولود کی ولادت پر ان کی خوشی و مسرت ہمارے لئے باعثِ شرمندگی تھی۔'' اس کے دھیمے لہجے سے دبا دبا غصہ اور حسد جھلک رہا تھا۔

''کیا وہ ایسا ہی حسین اور وجیہ ہے کہ اس کے پیدا ہوتے ہی چہار سو اس کے حسن و ذہانت کے ڈنکے بجنے لگے ہیں؟'' چھوٹے بیٹے معزالدین نے بھی غصے بھرے لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''اس حسین اور نوعمر سوتن کے آتے ہی میرا مستقبل تو پہلے ہی تاریک ہوچکا ہے۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ورقہ بانو نے بیٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے دلگرفتہ لہجے میں کہا۔ ''اور اب بیٹے کی ولادت کے بعد مجھے تم دونوں کے مستقبل کی فکر لاحق ہوگئی ہے، مجھے تو یہ خوف کھائے جارہا ہے کہ کہیں یہ بچہ تم دونوں کے حقوق غصب نہ کرلے۔''

''ہم تمہاری طرح کمزور اور بے زبان نہیں ہیں ماں!'' دونوں لڑکوں نے یک زبان ہوکر غصیلے لہجے میں کہا۔ ''تم اس سلسلے میں پریشان نہ ہو، ہم کسی صورت اسے اپنا حق مارنے نہیں دیں گے۔''

☆......☆......☆

وقت اپنی مخصوص رفتار میں آگے کی جانب بڑھتا رہا۔ ننھا شمس الدین اب پالنے سے نکل کر پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں، کے مصداق ننھی سی عمر میں ہی اس کی ذہانتوں اور صلاحیتوں کا اظہار ہونے لگا تھا، اس کا شوق، ذہانت اور طلبِ علم کا جذبہ دیکھتے ہوئے اسلم خان نے چھوٹی عمر سے ہی اس کی تعلیم و تربیت کیلئے اعلیٰ، قابل اور زیرک اساتذہ کا انتظام کردیا تھا۔ شمس الدین نے اپنے شوقِ علم کے حوالے سے باپ کو کبھی مایوس نہیں ہونے دیا تھا، محض پانچ برس کی عمر میں اس نے ناظرہ قرآن پاک ختم کرلیا تھا، اس کے علاوہ وہ اس چھوٹی سی عمر میں حدیث، فقہ، صرف، نحو، ریاضی اور دیگر علوم کو بھی نہایت ذوق و شوق سے سیکھ رہا تھا، اس کی حیرت انگیز ذہانت، قابلِ رشک حافظہ اور حصولِ علم کی قابلِ تحسین لگن کو دیکھتے ہوئے اس کے اساتذہ عش عش کر اٹھتے تھے اور اسلم خان کا دل مسرت و انبساط سے بھر جاتا تھا اور سر فخر و غرور سے بلند ہوجاتا تھا۔

سات سالہ شمس الدین اس کی آنکھوں کا نور اور دل کی ٹھنڈک تھا، جبکہ اس کے دونوں بڑے بیٹوں ضیغم خان اور معزالدین کی آنکھوں میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔

''والد صاحب جس طرح دن رات شمس الدین کی تعلیم و تربیت پر توجہ دیتے ہیں، کیا اسی طرح انہوں نے ہماری تعلیم و تربیت کا بھی خیال کیا تھا؟'' جب موقع ملتا تھا، وہ تینوں ماں اور بیٹے مل بیٹھتے تھے اور دل کے پھپھولے پھوڑنے میں مصروف ہوجاتے۔

''ہم چھوٹے تھے تو انہیں دوستوں کی محفلوں اور شکار کے شوق سے فرصت ہی کب تھی۔'' بڑے بیٹے ضیغم خان نے دل جلے انداز میں کہا۔

''اور اب دیکھو شمس الدین کو حفظ کیلئے خود مدرسے لے کر جاتے ہیں۔''

ایسا نہیں تھا۔ اسلم خان نے اپنے بڑے بیٹوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہیں دی تھی، اس کی لاکھ کوشش اور خواہش کے باوجود ان دونوں نے دو لفظ بھی پڑھ کر نہ دیئے تھے، ان کے چھوٹے اور غلیظ ذہنوں میں حسد، نفرت اور انتقامی جذبوں کے علاوہ کوئی اور شے سماتی ہی نہ تھی۔

جوں جوں شمس الدین بڑا ہورہا تھا، ان کے دلوں میں موجود اس کیلئے نفرت اور حسد کا جذبہ بھی بڑھتا جارہا تھا جبکہ ننھے شمس الدین کے دل میں اپنے بڑے بھائیوں کیلئے بے حد محبت اور عزت تھی۔ وہ فطرتاً ایک نیک اور محبت کرنے والا لڑکا تھا، وہ ہر وقت اسی کوشش میں لگا رہتا تھا کہ کسی طرح اور کسی طور اپنے بڑے بھائیوں کے دلوں میں اپنے لئے تھوڑی سی جگہ بنا سکے۔

''امی جان! بڑے بھائی جان اور چھوٹے بھائی صاحب مجھ سے خفا اور ناخوش کیوں رہتے ہیں؟'' اپنے بھائیوں کی طرف سے کسی بدسلوکی اور دل شکنی کے بعد وہ افسردہ لہجے میں تناشا خانم سے سوال کرتا تھا۔

''وہ دونوں تمہارے بابا جان کے ساتھ باہر کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں، مسلسل کام اور تھکن کے باعث شاید وہ کبھی تلخ و ترش ہوجاتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تم سے خفا اور ناخوش رہتے ہیں...... تمہاری طرح وہ بھی تم سے محبت کرتے ہیں۔'' تناشا خانم، شمس الدین کا سر اپنے سینے میں چھپا کر دلگرفتہ لہجے میں اسے جواب دیتی۔

اب کے برس موسمِ سرما کے آغاز سے ہی اسلم خان کی ماں شاہ دریغ کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ کچھ بڑھتی ہوئی عمر کا تقاضا بھی تھا، اب وہ پورے بیاسی برس کی ہوچکی تھی، معمولی سردی کے اثر نے دیکھتے ہی دیکھتے نمونیے کی شکل اختیار کرلی تھی۔

اسلم خان اپنی تمام مصروفیات تج کر ماں کی خدمت اور تیمارداری میں لگ گیا تھا۔ تناشا خانم اور ننھا شمس الدین بھی رات دن شاہ دریغ کی دیکھ بھال اور خدمت میں لگے رہتے۔ ورقہ بانو اور اس کے دونوں بیٹوں کو دادی کی تیمارداری کی ایسی کوئی خاص فکر نہ تھی، کبھی بھولے بھٹکے وہ بھی عیادت کیلئے آجاتے تھے۔

تمام تر دیکھ بھال اور علاج معالجے کے باوجود زندگی نے شاہ دریغ سے وفا نہ کی تھی اور بائیس دن کی بیماری کے بعد وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جاملی تھی۔

شاہ دریغ کی موت اسلم خان سے زیادہ تناشا خانم کیلئے کرب انگیز اور اذیت ناک تھی۔ گوکہ شاہ دریغ ایک صاف گو، تلخ مزاج اور غصیلی عورت تھی مگر تناشا خانم کی محبت اور بے لوث خدمت نے اس کی تلخی کو شیرینی میں بدل دیا تھا۔ کچھ ہی عرصے میں وہ تناشا کو مثلِ ماں کے چاہنے لگی تھی اور شمس الدین تو اس کی آنکھ کا تارہ تھا۔ دوسری بہو اور دوسرے پوتے سے اس کی بے تحاشا محبت نے پہلی بہو ورقہ بانو اور دونوں بڑے پوتوں کو اس سے متنفر اور بدظن کردیا تھا۔ سو اس کی موت ان تینوں کیلئے اطمینان و تسکین کا باعث ثابت ہوئی تھی۔

ورقہ بانو، ساس کی وجہ سے کسی قدر قابو میں رہتی تھی، اس کے انتقال کے بعد اب وہ کھل کر سامنے آگئی تھی اور نت نئے طریقوں سے اس نے تناشا خانم اور شمس الدین کو ستانا شروع کردیا تھا۔ تناشا خانم حرفِ شکایت زباں پر لائے بغیر صبر و تحمل سے اس کی ہر زیادتی برداشت کررہی تھی۔ دوسری طرف ضیغم خان اور معزالدین، شمس الدین کو خونخوار نظروں سے گھورتے رہتے، ان کا بس نہ چلتا تھا کہ اسے کچا چبا جاتے۔

پہلی بیوی اور بڑے بیٹوں کے رویوں کو دیکھتے ہوئے، اسلم خان نے جائداد اور جاگیر کی تقسیم کا فیصلہ کرلیا۔

''میرے دونوں بڑے بیٹے ناقص اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔'' اسلم خان نے اپنے احباب کی موجودگی میں مشاورت کی غرض سے بات کا آغاز کیا۔ ''اسی لئے میں نے سوچا ہے کہ میں اپنی جائداد کا بڑا حصہ اپنے چھوٹے بیٹے شمس الدین کے نام کردوں۔''

''مگر سردار! شمس الدین ابھی بہت چھوٹے ہیں۔'' نور خان نے متفکر لہجے میں اظہارِ خیال کیا۔ ''اگر کچھ دن اور آپ انتظار کرلیں تو بہتر ہوگا۔''

''میں نے تو پہلے ہی خاصی دیر کردی ہے نور خان......!'' اسلم خان نے رنجوری مسکراہٹ کے ساتھ اپنے مصاحب نور خان کی طرف دیکھا۔ ''رسول پاک ﷺ کا فرمان ہے، ہر مومن کو اپنی وصیت سرہانے رکھ کر سونا چاہئے، اس حوالے سے تو میں نے پہلے ہی بہت تاخیر کردی ہے...... اب مزید دیر نہیں کرنا چاہتا۔''

☆......☆......☆

''شمس الدین صرف علم کی پیاس رکھتا تھا۔'' تمام بات سننے کے بعد تناشا خانم نے خاوند سے کہا۔ ''بھلا اسے دولت و جاگیر کی کیا ضرورت ہے، آپ یہ سب ضیغم خان اور معزالدین کے نام کردیجئے، ویسے بھی بڑے ہونے کے ناتے ان کا حق فائق ہے۔''

''یہ جائداد و دولت میں نے اپنی شبانہ روز محنت سے حاصل کی ہے۔'' اسلم خان نے پریقین لہجے میں جواب دیا۔ ''اسے میں اپنی مرضی سے جسے چاہوں عطا کرسکتا ہوں، سو میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس جائداد کا تین گنا میں شمس الدین کے نام کردوں گا۔''

''مگر سوچئے اس طرح تو ضیغم خان اور معزالدین کی حق تلفی ہوگی۔'' تناشا خانم دلگیر لہجے میں بولی۔ ''اگر آپ تقسیم کرنا ہی چاہتے ہیں تو جائداد کو تین برابر حصوں میں تقسیم کیجئے۔''

''تم ضیغم اور معزالدین کی فطرت سے واقف نہیں ہو۔'' اسلم خان نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''وہ نکمے، عاقبت نااندیش اور بدطینت ہیں، وہ چند ہی برسوں میں ساری دولت و جائداد خاک میں ملا کر بیٹھ جائیں گے...... دولت و جائداد شمس الدین کے پاس ہوگی تو کم از کم انہیں سر چھپانے کا ٹھکانہ اور دو وقت عزت سے کھانا تو میسر آئے گا...... میں جو کچھ کررہا ہوں، ان دونوں کی بھلائی کی غرض سے ہی کررہا ہوں، میں ان کا بھی باپ ہوں اور انہیں قلاش اور مفلوک الحال نہیں دیکھ سکتا۔''

تناشا خانم خاموش ہوگئی تھی۔

یہ خبر ورقہ بانو تک پہنچی تو وہ غصے سے چیخ اٹھی تھی۔ ''آخر اس حسین جادوگرنی نے وہ مقصد حاصل کر ہی لیا جو مقصد لے کر وہ اس حویلی میں داخل ہوئی تھی...... آخر اس نے اسلم خان کے دل میں اس کے بیٹوں کیلئے نفرت بٹھا ہی دی اور حصولِ زر کیلئے اپنے بیٹے کیلئے راہ ہموار کردی۔''

ان دنوں ضیغم خان کی شادی کی بات اس کے بڑے ماموں طغرل خان کی بیٹی سے چل رہی تھی۔ تقسیم جائداد کی یہ خبر اس تک پہنچی تو وہ غصے سے بھرا بہن کے پاس پہنچا۔

''ورقہ بانو! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟''

''آپ جو سن رہے ہیں، وہ درست ہے۔'' ورقہ بانو نے جھلتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''تم کیا سمجھتی ہو، دولت اور جائداد کی غیر موجودگی میں کیا میں اپنی چہیتی بیٹی کا ہاتھ تمہارے نکمے اور کاہل بیٹے کے ہاتھ میں دے دوں گا؟'' طغرل خان نے کٹھور لہجے میں کہا۔ ''اگر تم میری بیٹی کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہو تو تمہیں اس غلط تقسیم کو روکنا ہوگا۔''

''مگر میں یہ کس طرح کرسکتی ہوں؟'' ورقہ بانو نے بے بسی سے جواب دیا۔

''تم شاید کچھ نہیں کرسکتیں ماں!'' ضیغم خان اور معزالدین نے ماں کے قریب آتے ہوئے دھیمے مگر سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مگر...... ہم سب کچھ کرسکتے ہیں...... کچھ بھی......!''

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟'' ورقہ بانو نے چونک کر بیٹوں کے غصیلے اور نفرت بھرے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''تم کیا سوچ رہے ہو؟''

''ہم وہی سوچ رہے ہیں، جو ہمیں بہت پہلے سوچ لینا چاہئے تھا۔'' معزالدین نے بھائی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن خیر......! ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔''

☆......☆......☆

شمس الدین مدرسے سے گھر آرہا تھا کہ ضیغم خان اور معزالدین نے اسے راستے میں ہی روک لیا۔

''کہاں سے آرہے ہو برادرِ عزیز......؟'' ضیغم خان نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر اسے روکتے ہوئے اپنے لہجے میں نرمی اور شفقت گھولتے ہوئے سوال کیا۔ شمس الدین کے ہوش سنبھالنے کے بعد سے آج یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے بڑے بھائی نے اس طرح مشفق اور نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔ اس کی حیرت مسرت بن کر اس کی آنکھوں کی گہری جھیلوں میں تیرنے لگی تھی۔

''ج...... جی...... ! وہ مدرسے...... سے......''

مدرسہ حویلی کے احاطے سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ پر اس سمت بے حد سناٹا رہتا تھا۔ اسی لئے اسلم خان خود ہی اسے مدرسے سے لاتا تھا۔ لیکن آج ناسازیٔ طبع کے باعث وہ معالج کے پاس چلا گیا تھا اور ننھا شمس الدین سبق سے فارغ ہوکر اکیلا ہی گھر کیلئے روانہ ہوگیا تھا۔

اس کے دونوں بڑے سوتیلے بھائی کئی دنوں سے کسی ایسے ہی موقع کا انتظار کررہے تھے۔ چہار سو پھیلتے شام کے سرمئی سایوں میں شمس الدین کو گھر کی جانب اکیلے آتے دیکھ کر ان کی چھوٹی چھوٹی مکار آنکھیں چمکنے لگی تھیں، وہ دونوں تیزی سے گھوڑے دوڑاتے شمس الدین کے پاس جا پہنچے تھے۔

''تم تو کافی عرصے سے مدرسے جارہے ہو، اب تک تو قرآن پاک حفظ ہوچکا ہوگا؟'' معزالدین نے گہری نظروں سے اطراف میں پھیلے سناٹے کا جائزہ لیتے ہوئے نرم لہجے میں سوال کیا۔

''جی قرآن کریم حفظ ہوچکا ہے، اب تو میں دہرا رہا ہوں۔'' ننھے شمس الدین نے مسرور اور کسی قدر فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

''اوہ! یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔'' ضیغم خان اس کی جانب بڑھتا ہوا بولا۔ ''اس کارنامے پر تمہیں تو کوئی انعام ملنا چاہئے...... بولو کیا انعام لوگے؟''

''آپ دونوں آج جس نرمی اور محبت سے پیش آرہے ہیں، میرے لئے یہ بات کسی انعام سے کم نہیں۔'' شمس الدین نے سچے لہجے میں جواب دیا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' معزالدین آگے بڑھا۔ ''شہر سے باہر ایک قافلہ ٹھہرا ہوا ہے، اس میں بخارا کا ایک سوداگر بھی ہے، سنا ہے اس کے پاس فروخت کیلئے نہایت نادر اور نفیس اشیاء ہیں، ہم خریداری کیلئے اسی کے پاس جارہے تھے، سوچ رہے ہیں تمہیں بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں تاکہ وہاں سے تمہاری پسند کی کوئی چیز خرید کر تمہیں انعام کے طور پر دے سکیں۔''

''مگر...... مگر میں...... امی جان اور بابا جان کی اجازت کے بغیر آپ کے ساتھ کس طرح جاسکتا ہوں؟'' شمس الدین نے دور جھکتے ہوئے حیرت اور تذبذب سے جواب دیا۔

''ارے پگلے......! بھائیوں کے ساتھ جانے کیلئے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' معزالدین ہنسا۔ ''حتیٰ کہ ماں، باپ کی بھی نہیں بلکہ وہ دونوں تو اس بات پر خوش ہوں گے کہ ہمارے درمیان حائل خلیج دور ہوگئی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' شمس الدین نے معصومیت سے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو بس اب جلدی سے میرے گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔'' ضیغم نے اسے نرم پڑتے دیکھ کر ذرا سخت لہجے میں حکم دیا۔ ''پہلے ہی خاصی دیر ہوچکی ہے مزید تاخیر کسی پریشانی کا باعث ثابت ہوسکتی ہے۔'' سوتیلے بھائیوں کی محبت دیکھتے ہوئے ان کی خفگی کے خوف سے نہ چاہتے ہوئے بھی شمس الدین ان کے ساتھ جانے کیلئے آمادہ ہوگیا تھا۔ ضیغم خان نے تھوڑا سا جھک کر دونوں ہاتھوں سے تھام کر اسے اپنے گھوڑے پر اپنے سامنے بٹھا لیا تھا اور اگلے ہی لمحے ان کے گھوڑے تیز رفتاری سے آگے کی سمت روانہ ہوگئے تھے۔

''اوہ! مجھے تو سخت پیاس لگ رہی ہے۔'' ذرا ہی دور نکلتے ہی معزالدین نے گھوڑا روک کر اپنی پانی کی چھاگل اٹھائی۔ ''شمس الدین کیا تم بھی کچھ پینا پسند کروگے؟'' اس نے ضیغم خان کے گھوڑے کے قریب پہنچ کر اس سے سوال کیا۔

''جی! پیاس تو مجھے بھی محسوس ہورہی ہے۔'' شمس الدین نے جواب دیا۔

''تو لو یہ مشروب پی لو۔'' معزالدین نے چھاگل اس کی طرف بڑھائی۔ ''سرد، لذیذ اور شیریں مشروب ہے، تمہیں پسند آئے گا۔''

''بھائی صاحب! پہلے آپ پیجئے کیونکہ پہلے آپ نے پیاس کا اظہار کیا تھا۔'' ننھے شمس الدین نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''اف! تم دونوں بلاوجہ کے تکلف میں وقت ضائع کررہے ہو۔'' ضیغم خان نے اپنی چھاگل معزالدین کی طرف بڑھاتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ''تم اپنی چھاگل شمس الدین کو دے کر میری چھاگل سے اپنی پیاس بجھالو۔''

شمس الدین نے جلدی سے معزالدین کی چھاگل تھام لی تھی۔ مشروب ٹھنڈا، شیریں اور خوش ذائقہ تھا، چند گھونٹ پیتے ہی اسے ایک عجیب سے سرور کا احساس ہونے لگا، آنکھیں بند ہوئیں اور سر چکراتا ہوا محسوس ہورہا تھا، اگلے ہی لمحے مشروب سے بھری چھاگل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جاگری تھی اور اس کا چکراتا، گھومتا سر ضیغم خان کے حسد اور نفرت سے بھرے کشادہ سینے سے جالگا تھا۔

ضیغم خان اور معزالدین نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مطمئن انداز میں اثبات میں سر ہلایا تھا اور ضیغم خان نے اپنی پشت پر لٹکتی چادر کو کھینچ کر شمس الدین کو اس چادر سے ڈھانپ لیا تھا۔

اور اگلے ہی لمحے ان دونوں کے گھوڑے برق رفتاری سے شہر سے باہر پڑاؤ ڈالے قافلے کی جانب اڑے چلے جارہے تھے۔

(جاری ہے)

وقت کے گزرتے لمحوں کے چہرے پر گاڑھی سیاہی مچی ہوئی تھی۔ نیلا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا، اوائل تاریخوں کا باریک ہلال اور ٹمٹماتے ہوئے تارے بادلوں کی دبیز چادر تلے منہ چھپائے پڑے تھے، یہاں سے وہاں تک تیرہ و تاریک آکاش پر روشنی کی ہلکی سی رمق تک موجود نہ تھی، ہر سمت روح میں اترتی گہری تاریکی تھی اور ہوا کے تیز



اشتیاق فاطمہ عظمی | قسط : 2

بین کرتے شور مچاتے جھکڑ تھے۔

فصیل شہر سے باہر پڑاؤ انداز قافلہ کوچ کیلئے تیار تھا۔

"آقا! یوں اچانک آپ نے کوچ کا فیصلہ کرلیا؟" بخارا کے سوداگر خاور بخاری کا بوڑھا غلام اجمال حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

"فروخت کی غرض سے خریدا گیا یہ مال جو اونٹوں اور گھوڑوں پر لدا ہے۔" خاور بخاری نے سامانِ فروخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "بارش کے ایک چھینٹے کے ساتھ ہی برباد ہو جائے گا، اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ بارش شروع ہونے سے قبل ہی ہم اس علاقے سے دور چلے جائیں۔"

خاور بخاری اپنے عربی النسل گھوڑے کی پشت پر سوار ہو چکا تھا، جبکہ غلام اجمال ہاتھ میں قندیل اٹھائے چاروں طرف کا جائزہ لیتا پھر رہا تھا، مبادا کوئی قیمتی یا ضروری شے پیچھے پڑی نہ رہ جائے۔

تب ہی دور سے دو گھڑ سوار تیزی سے ان کی جانب بڑھتے دکھائی دیئے تھے۔

"بھلا اتنی تاریک اور سرد رات میں یہ کون لوگ آرہے ہیں؟" سوداگر نے اپنے غلام اجمال سے سوال کیا۔

"غالباً یہ وہی دونوں بھائی ہیں جو چند روز قبل آپ سے ایک معاملہ طے کرنے آئے تھے۔"

"اوہ......!" سوداگر نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

ذرا ہی دیر میں وہ دونوں قریب پہنچ چکے تھے۔

"گویا کہ ہم وقت پر پہنچ گئے۔" گہری تاریکی کا پردہ چاک کرتی ضیغم خان کی آواز ابھری۔ "ہمیں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو تمہارا قافلہ روانہ ہو چکا ہوتا۔"

"ہاں ایسا ہی کچھ ہے۔" سوداگر خاور بخاری نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ "ہمیں بارش شروع ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے روانہ ہو جانا ہے، تم کام کی بات کرو۔"

"ہم اپنے وعدے کے مطابق مال فروخت لے آئے ہیں۔"

"مگر مال لانے میں تم نے بہت دیر کردی ہے۔" خاور بخاری نے کاروباری لہجے میں کہا۔ "ہم رختِ سفر باندھ چکے ہیں، اس لئے اس وقت ہم مزید کچھ لینے کیلئے تیار نہیں ہیں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" ضیغم خان کی تیز آواز میں ہلکی سی گھبراہٹ بھی شامل ہو گئی تھی۔ "تم نے اسے خریدنے کی ہامی بھری تھی، اسی لئے ہم اسے یہاں لے کر آئے ہیں۔"

"اگر تم اسے فروخت کرنے پر ہی مصر ہی ہو تو......!" خاور بخاری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو طے شدہ رقم سے آدھی رقم ملے گی۔"

"تمہیں دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔" ضیغم خان نے کڑوے لہجے میں کہا۔ "کہ تم بالآخر ایسا ہی کچھ کرو گے۔"

"ہمارے پاس وقت کم ہے۔" سوداگر نے نخوت بھرے لہجے میں کہا۔ "سودا نہیں کرنا تو واپس جا سکتے ہو، چاہو تو اپنا نام بتاتے جاؤ۔"

"تمہیں نام و نسب کی بجائے صرف سودے سے غرض ہونی چاہئے۔" ضیغم خان کی درشت آواز ابھری۔ "قیمت چکاؤ، مال اٹھاؤ اور اپنی راہ لو۔"

"ٹھیک ہے، مال کہاں ہے؟" خاور بخاری نے غلام کو قندیل لانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں قیمت چکانے سے پہلے روشنی میں مال کو پرکھنا چاہوں گا۔"

"ضرور......!" ضیغم خان نے اپنے سینے سے لگے بے سدھ بیٹھے ننھے شمس الدین پر سے چادر ہٹادی۔

قندیل کے مدھم اجالے میں اس کا دل نواز چہرہ ماہِ کامل کی طرح دمک رہا تھا۔

"ماشاء اللہ" خاور بخاری کے لبوں سے بے ساختہ نکلا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر بے ہوش شمس الدین کو اپنی جانب کھینچ لیا۔

"مگر یہ تو ہوش میں نہیں ہے۔" بوڑھے غلام اجمال نے اسے سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا اسے کوئی نشہ آور چیز دی گئی ہے؟"

"ہاں۔" معزالدین نے پہلی بار زبان کھولی۔ "محض چند گھونٹ تاڑی کے دیئے ہیں، صبح تک مدہوشی جاتی رہے گی۔"

خاور بخاری نے طلائی سکوں سے بھری تھیلی ضیغم خان کی طرف اچھال دی تھی اور اس نے تھیلی تھامتے ہی گھوڑے کا رخ موڑ لیا تھا۔ اسے طے شدہ قیمت سے کم ملنے پر افسوس تو تھا مگر سوتیلے بھائی سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جان چھٹ جانے پر بے حد خوشی محسوس ہو رہی تھی، اب اس کے باپ کی جائداد اور دولت صرف ان دونوں بھائیوں کیلئے تھی، تیسرے نام نہاد حصے دار کو وہ سیاہ رات کے آنچل میں باندھ کر فروخت کر آئے تھے۔

برادرانِ یوسف کی طرح انہوں نے بھی اپنے یوسف سے نجات حاصل کرلی تھی۔ وہ دونوں مسرت بھرے انداز میں جھومتے، مسکراتے، گنگناتے گھر کی جانب واپس جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

آسمان کے نیلے آنچل پر روپہلے ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔ بدرِ کامل کی سنہری چاندنی بھیگتی رات کے ساتھ کچھ ماند پڑ گئی تھی، رات دبے پاؤں سفر کرتی صبح کاذب کی طرف بڑھ رہی تھی، دور مشرقی خاکستری پہاڑیوں کے اوٹ سے کرنوں کا دھندلا سا عکس نمودار ہوتا محسوس ہو رہا تھا، بادِ سحر کے مدھر جھونکوں میں دل پذیر سی خنکی اور دل آویز سی نرمی گھلی ہوئی تھی۔

دور کسی بستی کی مسجد سے موذن کی مترنم آواز ہوا کے دوش پر سفر کرتی بے سدھ پڑے شمس الدین کی سماعت سے آٹکرائی تھی۔

"اللہ اکبر" ربِ ذوالجلال کی کبریائی کی صدا سنتے ہی اس نے پٹ سے اپنی بند آنکھیں کھول دی تھیں۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ وہ کہاں ہے، اونٹوں، خچروں اور گھوڑوں پر مشتمل یہ چھوٹا قافلہ جو اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا، اس کیلئے حیران کن تھا۔

"میں کہاں ہوں بھائی جان؟" اس نے حیران و ہراساں انداز میں اپنے پیچھے بیٹھے شخص کی طرف پلٹ کر پوچھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے پیچھے اس کا بڑا سوتیلا بھائی ضیغم خان موجود ہوگا اسی لئے بے ساختہ اس کے لبوں سے اس کا نام نکلا تھا۔

"اچھا! تو تم ہوش میں آگئے؟" اس کے پیچھے گھوڑے کی پشت پر سوار بوڑھے غلام اجمال نے کسی قدر مسرت بھرے انداز میں سوال کیا۔

"آپ کون ہیں؟" شمس الدین نے حیرت سے پوچھا۔ "اور میرے بھائی کہاں ہیں؟"

"اوہ......! تو وہ بھی برادرانِ یوسف کی ہی طرح تمہارے بھائی تھے؟" بوڑھے غلام نے پرتاسف انداز میں سر ہلایا۔

"آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟" شمس الدین نے دوبارہ گھبرائے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

"ہم بخارہ جا رہے ہیں۔" بوڑھے اجمال نے جماہی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"بخارہ......؟" شمس الدین کی حیرت میں اضافہ ہوا۔ "مجھے کہیں نہیں جانا...... مجھے اپنے گھر جانا ہے...... میری امی جان پریشان ہو رہی ہوں گی...... خدا کیلئے مجھے میرے گھر پہنچا دیجئے۔"

"اب اس گھر اور زندگی کو بھول جاؤ نادان بچے!" اجمال نے متنبیہ بھرے انداز میں اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اب تم زندگی میں کبھی اپنی ماں کا چہرہ نہ دیکھ سکو گے، وہ سب کچھ بہت پیچھے رہ گیا ہے...... تقدیر نے تمہارے لئے ایک نئی کہانی رقم کی ہے جس میں اب تمہارا ایک غلام کا کردار ہے...... ایک بے زبان مجبور اور زرخرید غلام!"

"غلام......؟" شمس الدین اس لفظ کے معنی سے ناآشنا تھا۔ "یہ غلام کیا ہوتا ہے؟"

"وقت خود ہی تمہیں سمجھا دے گا۔" اجمال تدبر بھرے انداز میں مسکرایا تھا اور شمس الدین کی دمکتی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئی تھیں۔

☆......☆......☆

دنوں کے مسلسل سفر کے بعد آخر وہ لوگ بخارہ میں داخل ہو گئے تھے۔ رو رو کر اس کی آنکھوں کے سوتے خشک ہو چکے تھے، اب اس نے خود کو حالات کے حوالے کر دیا تھا۔

"اجمال! صدر جہان کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ایک نوعمر، خوبرو غلام بچہ میرے پاس فروخت کیلئے موجود ہے، اگر اسے خریدنا ہے تو رقم لے کے آجائے۔" پڑاؤ ڈالتے ہی خاور بخاری نے اجمال سے کہا تھا۔

"مگر آقا! اس بچے کو خریدے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔" بوڑھے اجمال نے محبت بھری نظروں سے معصوم اور خوش جمال شمس الدین کی طرف دیکھتے ہوئے دبے مگر حیران لہجے میں سوال کیا۔ "آخر اسے فروخت کرنے کی اتنی جلدی کیا ہے؟"

اتنے دنوں کی معیت اور سنگت نے اجمال کے دل میں اس خاموش طبع، سادہ لوح اور مظلوم بچے کیلئے نرم گوشے پیدا کر دیئے تھے، وہ اب اسے خود سے دور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اجمال! تم جانتے ہو میں ایک سوداگر ہوں اور مال فروخت کرنے کیلئے ہی خریدتا ہوں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں آقا!" اجمال جلدی سے بولا۔ "مگر اس بچے کو اگر کچھ اور بڑا ہو جانے کے بعد بیچا جائے تو زیادہ اچھی قیمت حاصل ہو سکتی ہے۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو اجمال؟" خاور بخاری متحیر اور کسی قدر مضحکہ اڑانے والے لہجے میں بولا۔ "ہم اپنے پاس موجود بے شمار مال تجارت فروخت کریں گے یا اس چھوٹے بچے کی پرورش کریں گے...... تم فوراً جاؤ اور صدر جہان کو بلالاؤ۔"

"آقا! اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں؟" بوڑھے اجمال نے لحظہ بھر خاموش رہ کر قدرے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ ایک بے حد اچھا اور صالح بچہ ہے، اتنے دنوں کی رفاقت نے میرے دل میں اس کی الفت پیدا کر دی ہے...... میں چاہتا ہوں اب اس کے ساتھ ظلم زیادتی نہ ہو۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" سوداگر نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "جب ہی تو میں اسے صدر جہان جیسے نیک طینت اور اچھے انسان کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہ رہا ہوں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ آج کل اس کی دکان ٹھنڈی پڑی ہے، وہ مجھے اس گوہرِ نایاب کی زیادہ اچھی قیمت نہ دے سکے گا، اس کے باوجود میری خواہش ہے کہ اسے وہ خریدے کیونکہ وہ ایک اچھا، محبت کرنے والا، مشفق انسان ہے، وہ یقیناً اس کے ساتھ مہربانی کا رویہ روا رکھے گا۔"

☆......☆......☆

ادھیڑ عمر، خوش شکل اور خوش وضع صدر جہان، شمس الدین کو خرید کر اپنے ساتھ لئے جب گھر پہنچا تو اس کی نیک اطوار اور دیندار بیوی عرفانہ اس اداس آنکھوں اور معصوم چہرے والے بچے کو دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔

"یہ بچہ کون ہے؟"

"غلام بچہ ہے۔" صدر جہان نے شمس الدین کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بیوی کو بتایا۔ "سوداگر خاور بخاری نے بے حد کم قیمت میں صرف اس شرط پر میرے حوالے کیا ہے کہ میں اس کے ساتھ محبت اور مہربانی کا سلوک کروں اور اس کی تعلیم و تربیت پر توجہ دوں۔"

"اتنے پیارے اور معصوم بچے کے ساتھ کون ظلم زیادتی کر سکتا ہے؟" عرفانہ نے شمس الدین کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوداگر خاور کا غلام اجمال بتا رہا تھا کہ یہ ایک فرمانبردار، ذہین اور تعلیم کا شوقین بچہ ہے، میری خواہش ہے کہ تم ہمارے بچوں کے ساتھ اس بچے کی تعلیم و تربیت پر بھی توجہ دو۔"

"ضرور......!" عرفانہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر شمس الدین سے مخاطب ہو کر بولی۔ "بیٹا! میرے پاس آؤ۔"

اس کے ممتا بھرے لہجے پر چونک کر اس نے اس کی جانب دیکھا تھا۔ پھر سر جھکائے خاموشی سے اس کے قریب چلا آیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" عرفانہ نے اس کے ماتھے پر آئے سیاہ ریشمی بال سمیٹتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"شمس الدین۔" اس نے سر جھکا کر دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"کیا تمہاری امی جان بھی تمہیں اسی نام سے پکارتی تھیں؟" عرفانہ نے پوچھا۔

"امی جان......!" شمس الدین کے لرزتے لبوں سے سسکی سی نکلی۔ "وہ جب بہت خوش ہوتی تھیں تو مجھے "التمش" کہتی تھیں۔"

"اوہ!" عرفانہ نے اس کی نم پلکوں کی طرف محترم نگاہوں سے دیکھا۔ "آج سے میں بھی تمہیں "التمش" کہوں گی...... میں شاید تمہاری ماں جیسی تو نہیں بن سکتی لیکن تمہیں میں اپنا بیٹا بنا سکتی ہوں، شاید تم مجھے اپنی امی جان نہ سمجھو مگر میں تمہیں آج سے اپنے دونوں بیٹوں کی طرح ہی سمجھوں گی۔"

چند لمحوں تک شمس الدین نے بے یقین نظروں سے عرفانہ کی طرف دیکھا۔ پھر ایک دم سے "امی جان" کہہ کر اس کے سینے سے جا لگا۔ اس کے ممتا بھرے وجود سے اسے اپنی ماں نتاشا خانم کی سی خوشبو آتی محسوس ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

وقت ایک بار پھر اپنی مخصوص ڈگر پر چل نکلا تھا۔

زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس چھوٹے سے نیم پختہ گھر میں التمش کیلئے ایک آسودہ زندگی گزارنے کیلئے بہت سے سامان تھے۔ مہربان باپ جیسا صدر جہان تھا، محبت کرنے والی ماں عرفانہ تھی۔ جب وہ اسے پیار سے "التمش" کہہ کر بلاتی تو اسے اپنی بھولی بسری ماں کا لب و لہجہ یاد آجاتا تھا اور محبت اور لاڈ کرنے والے دو بڑے بھائی...... اس گھر میں وہ گھر کے ایک اہم اور لاڈلے فرزند کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ صدر جہان نے اس کے شوق اور لیاقت کو دیکھتے ہوئے اس کیلئے بھی ایک استاد کا بندوبست کر دیا تھا۔

وہ فطرتاً ایک نیک اور متقی بچہ تھا۔ اپنے دونوں بھائیوں اور صدر جہان کے ساتھ باقاعدہ باجماعت نماز ادا کرتا تھا، وہ حافظ قرآن تھا، صبح و شام قرأت کے ساتھ تلاوت کرتا تو ہر سمت اس کے مسحور کن لحن کا نور پھیل جاتا۔ صلوٰۃ و عبادت اور حصول علم کے بعد جو وقت بچ رہتا، التمش وہ وقت صدر جہان کی دکان پر گزارتا تھا۔ وہ ایک محنتی، دیانتدار، نیک، صالح اور خوش خلق بچہ تھا، گیارہ برس کی عمر سے ہی اس نے باقاعدگی سے تہجد کی نماز کی ادائیگی شروع کر دی تھی۔

گھر کا ماحول بھی بے حد شائستہ اور پاکیزہ تھا۔ صدر جہان بذاتِ خود ایک نیک، متقی اور صالح مسلمان تھا اور خدا رسیدہ بزرگوں اور متقی لوگوں کی صحبت میں رہنا پسند کرتا تھا، خود بھی نعتیہ شاعری کرتا اور سماع کی محفلوں میں شوق سے شریک ہوتا، اپنے عہد کے برگزیدہ بندوں قاضی حمید الدین ناگوری سے وہ خاص انسیت اور عقیدت رکھتا تھا۔

اس شام وہ گھر لوٹا تو بے حد مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے پر خوشی کے رنگ بکھرے ہوئے تھے اور لبوں پر تبسم کی کلیاں چٹک رہی تھیں۔

"کیا بات ہے، آج آپ بہت خوش نظر آرہے ہیں؟" عرفانہ نے اس کے سامنے دسترخوان پر کھانا چنتے ہوئے مسکرا کر سوال کیا۔ اس کے ہاتھ دھلانے کیلئے آفتابہ تھامے کھڑے التمش نے چونک کر صدر جہان کے دمکتے چہرے کی طرف دیکھا۔

"قاضی حمید الدین قبلہ ہمارے شہر میں تشریف لانے والے ہیں۔" صدر جہان نے مسرور لہجے میں بتایا۔ "ان کے ساتھ صوفی فقراء کی ایک جماعت بھی ہوگی، میری خواہش ہے کہ میں انہیں اپنے گھر میں مدعو کروں اور ایک محفلِ سماع کا اہتمام ہو۔"

"محفلِ سماع......؟" التمش نے حیرت سے سوال کیا۔ "یہ کیا ہوتی ہے؟"

"بنیادی طور پر تو یہ فقراء کی محفل ہوتی ہے جہاں حمدیہ اور نعتیہ کلام پیش کیا جاتا ہے، اگر قبلہ قاضی صاحب نے میری دعوت قبول کرلی تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ محفلِ سماع کیا ہوتی ہے۔"

صدر جہان کے جواب نے التمش کے دل میں شوق کی شمعیں روشن کردی تھیں۔ اب وہ قاضی صاحب کے بارے میں جاننے کا خواہاں تھا۔

"یہ ایک خدا رسیدہ اور برگزیدہ انسان ہیں۔" صدر جہان عقیدت اور محبت بھرے لہجے میں بتا رہا تھا۔ "ایک ایسے مردِ مومن کہ جس پر اک نگاہ ڈال دیں، اس کی تقدیر بدل جائے۔"

التمش اس پوری رات سو نہ سکا تھا۔ وہ تمام رات محفلِ سماع اور قاضی حمید الدین ناگوری کے بارے میں سوچتا رہا تھا، ان کو دیکھنے اور ان سے ملنے کیلئے اس کا دل بے کل و بیتاب ہو گیا تھا۔

آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور قاضی صاحب اپنی جماعت کے ساتھ صدر جہان کے گھر میں قدم رنجہ ہوئے۔ کئی دنوں سے گھر میں مہمانوں کی آمد کیلئے اہتمام و انتظام ہو رہا تھا۔ التمش، عرفانہ اور صدر جہان کے ساتھ ہر کام میں شامل تھا۔ عرفانہ نے کشادہ ایوان کو صاف کر کے دریوں پر سفید چاندنیاں بچھا دی تھیں، التمش نے دیوار کے ساتھ سہارے کیلئے گاؤ تکیے سجا دیئے تھے، روشنی کیلئے جابجا پیتل کے شمع دانوں میں کافوری موی شمعیں لگا دی گئی تھیں جن کے گل تراشنے کی ذمے داری التمش نے از خود لے لی تھی۔ کھانے سے قبل اس نے تمام مہمانوں کے ہاتھ دھلوائے تھے۔ جب وہ پانی کا آفتابہ تھامے قاضی حمید الدین ناگوری کے پاس پہنچا تو انہوں نے یک لخت چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

التمش نے نہایت ادب اور قرینے سے ان کے ہاتھ دھلوائے تھے پھر رومال سے ہاتھ خشک کئے تھے۔ انہوں نے مہربان نظروں سے اس بچے کی طرف دیکھا۔

کھانے کے بعد التمش نے تمام معزز مہمانوں کی خدمت میں قہوہ پیش کیا، قہوے کے بعد محفلِ سماع کا آغاز ہوا تھا۔ التمش کیلئے یہ سب کچھ بالکل نیا اور انوکھا تھا، اس پر ایک سرور اور وجد کی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی، اس کیفیت میں ڈوبے وہ تمام رات محفل میں مہمانوں کی خدمت میں لگا رہا۔ جب بھی کسی کو پانی یا کسی اور چیز کی ضرورت ہوتی، وہ لپک کر اس کی خدمت میں پیش کر دیتا، خصوصاً وہ قاضی صاحب کی خدمت میں تمام رات پیش پیش رہا اور تمام رات وقفے وقفے سے اٹھ کر وہ شمعوں کے گل بھی کاٹتا رہا۔

قاضی حمید الدین ناگوری صبح تک اس کا بنظرِ غائر جائزہ لیتے رہے تھے اور اس کی خدمت اور جذبہ شوق سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔

وقتِ رخصت انہوں نے صدر جہان سے پوچھا۔ "صدر جہان! تمہارے لڑکوں کو تو میں پہچانتا ہوں پھر یہ بچہ کون ہے؟"

"یہ بچہ غلام ہے۔" صدر جہان نے سر جھکا کر مودبانہ لہجے میں جواب دیا۔ "مگر مجھے اپنے لڑکوں کی طرح ہی عزیز ہے۔"

قاضی حمید الدین ناگوری نے التمش کو اشارے سے قریب بلایا اور برجستہ کہا۔ "اتنے اچھے، نیک طینت اور صالح بچے کو غلام نہیں سلطان ہونا چاہئے۔"

پھر وہ دیر تک اسے گہری نظروں سے دیکھتے رہے۔ پوری محفل پر سکوت طاری تھا، سب لوگ نگاہیں جھکائے خاموش کھڑے تھے، خود التمش نگاہیں جھکائے ساکت و جامد کھڑا تھا۔ قاضی صاحب نے آگے بڑھ کر جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور زیرِ لب کہا۔ "آج سے تو ہماری نگاہ میں غلام نہیں سلطان ہے۔"

التمش کی ہی نہیں کسی کی بھی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اس قول کا مطلب کیا ہے۔

☆......☆......☆

اب کے برس بارش کا موسم اپنے ساتھ تباہیاں لے کر آیا تھا۔ جل تھل ایک ہو گیا تھا، کتنے ہی گھر زمین بوس ہو گئے تھے اور بازار کے بازار اجڑ گئے تھے۔

صدر جہان کا گھر اور دکان دونوں ہی اس تباہی کی نذر ہو گئے تھے۔ گھر کی چھت منہدم ہو گئی تھی اور شہتیر تلے دبنے کے باعث صدر جہان کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور اب وہ بستر پر پڑا کراہتا رہتا تھا، گھر کی اکثر دیواریں بھی زمین بوس ہو چکی تھیں، دکان کا مال و اسباب اس طوفان باد و باراں میں برباد ہو گیا تھا، خود صدر جہان اس قابل نہ رہا تھا کہ دکان کی خبر لیتا، نہ گھر سالم رہا تھا نہ کاروبار...... اور وہ خود معذور ہو کر بستر پر پڑ گیا تھا۔

عجب کسمپرسی اور افلاس کا عالم تھا۔ صدر جہان کے علاج معالجے گھر کی از سرِ نو تعمیر اور نئے سرے سے کاروبار جمانے کیلئے رقم کی ضرورت تھی جس کی کوئی سبیل نہ تھی۔

صدر جہان سخت پریشانی کا شکار تھا۔

سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے؟ ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا تھا، امید کی کوئی رمق تک نہ تھی۔ آخر شب و روز کے سوچ بچار کے بعد اس نے اس مشکل کا ایک حل تلاش کیا۔

"اگر...... ہم التمش کو فروخت کریں تو......؟"

"کیا کہہ رہے ہو تم......؟" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی بیوی عرفانہ نے حیرت اور بے یقینی سے کہا۔ "افلاس اور مفلوک الحالی کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اپنے بچوں کو فروخت کرنے کے بارے میں سوچنے لگیں۔"

"میں اپنے بچوں کی نہیں...... التمش کی بات کر رہا ہوں۔" صدر جہان نے دھیمے لہجے میں وضاحت کی۔ "تم شاید بھول رہی ہو، وہ ہمارا غلام ہے اور غلاموں کو فروخت کرنے کیلئے ہی خریدا جاتا ہے۔"

"بے شک تم نے اسے خریدا تھا۔" عرفانہ نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ "مگر میں تمہیں اسے ہرگز بیچنے نہ دوں گی...... وہ مجھے اپنے بچوں کی طرح ہی عزیز ہے۔"

"وہ مجھے بھی عزیز ہے۔" صدر جہان نے دلگرفتہ اور افسردہ لہجے میں کہا۔ "مگر سوچو اس کسمپرسی اور مفلوک حالی کے عالم میں اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے؟"

ادھ کھلے کواڑ کے اس پار موجود التمش کی سماعت تک صدر جہان اور ماں کی طرح چاہنے والی عرفانہ کی باتیں پہنچ رہی تھیں اور وہ خلافِ عادت دروازے پر رک کر ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

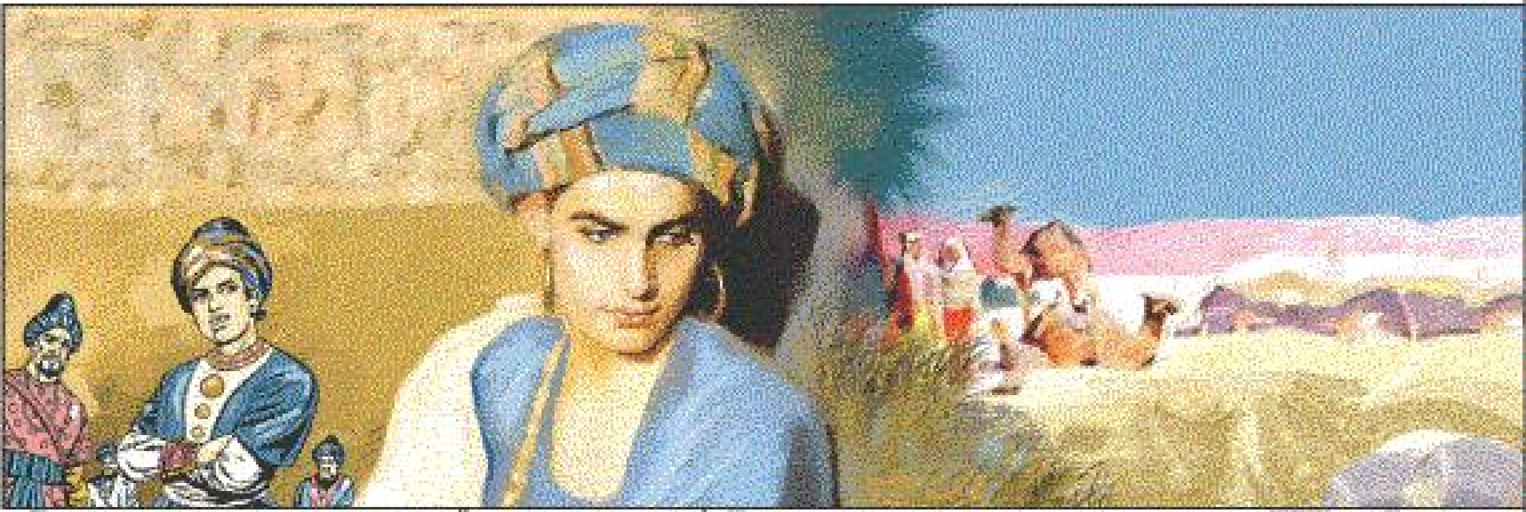
یہ گھر اس کی پناہ گاہ تھا۔ اس گھر نے اسے بہت کچھ دیا تھا، یہاں اسے باپ کی شفقت، ماں کی ممتا اور بھائیوں کی محبت ملی تھی، وہ اس گھر اور گھر کے مکینوں سے جدا ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر تقدیر اسے آج پھر اس دوراہے پر لے آئی تھی جہاں سے جدائی کا سفر شروع ہوتا تھا۔ وہ اپنے دل میں اس گھر اور گھر والوں کیلئے جو الفت اور چاہت رکھتا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ وہ ان مہربان لوگوں کے بُرے وقت میں کام آئے۔ گھر میں گھر کے ایک فرد کی طرح رہنے کے باوجود وہ اس حقیقت کو کبھی نہیں بھولا تھا کہ وہ ایک غلام ہے اور غلام کا کام بے چوں و چرا حکم بجالانا اور مقدر...... وقت بے وقت بکنا ہوتا ہے۔

سو اس مشکل گھڑی میں اس نے اپنے آقا صدر جہان کے کام آنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے دو قدم آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔

"کون.....؟" اندر سے صد جہان کی متحیر آواز ابھری پھر اس نے جھانک کر ادھ کھلے دروازے میں ایستادہ الشمس کی طرف دیکھا۔

"اوہ.....! یہ تم ہو؟ اندر آجاؤ الشمس!"

الشمس حسب عادت نگاہیں اور سر جھکائے اندر داخل ہو گیا اور بغیر کسی تمہید کے اس نے زیر بحث مسئلے پر بات شروع کر دی اور کافی بحث و



مباحثے کے بعد وہ عرفانہ کو نیم رضامند کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"الشمس! تم مجھے کیسے امتحان میں ڈال رہے ہو، میرے بیٹے؟" عرفانہ نے بھیگی پلکوں سے اس کے حسین مگر غمگین چہرے کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے جدا ہو کر کیونکر زندہ رہ سکوں گی؟"

"ذرا میرے بارے میں سوچئے۔" الشمس نے بھیگی پلکوں اور نم لہجے میں کہا۔ "میں دوسری بار اپنی ماں سے جدا ہونے جا رہا ہوں، آپ کے پاس میرے علاوہ دو اور بیٹے موجود ہیں جبکہ آپ سے دور ہو کر میں بھری دنیا میں اکیلا رہ جاؤں گا.....لیکن ہمیں یہ کرنا ہی ہوگا.....یہ تقدیر کا فیصلہ ہے جس کے سامنے ہمیں سر جھکانا ہی ہوگا۔"

"الشمس! میرے بچے تمہاری محبت میری زندگی ہے.....میں تمہارے بغیر.....!" عرفانہ کی آواز آنسوؤں کے ریلے میں بہہ گئی۔

"محبت، قربت اور رفاقت کی محتاج نہیں ہوتی ماں!" الشمس نے دکھی مگر مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "میں محض سات برس کا تھا جب اپنی سگی ماں سے جدا ہوا.....آج ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو ذہن کے پردے پر ایک دھندلا سا خاکہ ابھرتا ہے جو چند ہی لمحوں میں آپ کی شبیہ میں ڈھل جاتا ہے.....ان سے بچھڑ کر بھی میرا ان سے محبت کا رشتہ قائم ہے.....بالکل اسی طرح آپ سے جدا ہو کر میں کہیں بھی چلا جاؤں مگر آپ کی محبت کی مہکار مرتے دم تک میری روح کو سرشار رکھے گی اور آپ سے ممتا اور محبت کا یہ رشتہ کبھی ٹوٹنے نہ پائے گا۔"

الشمس کی آواز بھرا گئی تھی۔ عرفانہ نے کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

اگلے دن صد جہان نے اپنے ایک پرانے واقف کار حاجی بخاری کو بلا کر اس سے کہا تھا۔

"حاجی بخاری! یہ شمس الدین ہے.....یہ مجھے میرے بیٹوں کی طرح ہی عزیز ہے، اگر اس قدر مجبوری نہ ہوتی تو میں اسے فروخت کرنے کے بارے میں سوچتا ہی نہیں مگر ضرورت خنجر کی طرح میرے دل میں پیوست ہو گئی ہے اور میں اس کاری زخم کے طفیل اس گوہر نایاب کو بیچنے پر مجبور ہو گیا ہوں.....تم اگر مناسب قیمت لگاؤ تو میں اپنے جگر کا یہ ٹکڑا تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔"

بوڑھے اور حریص حاجی بخاری نے گہری نظروں سے شمس الدین کی طرف دیکھا۔

وہ ایک گیارہ بارہ برس کا سادہ لوح، معصوم اور بے حد پیارا بچہ تھا، چند ہی برسوں میں وہ ایک توانا خوبرو وجیہ جوان بن جائے گا.....اسے صد جہان کی ضرورت اور مجبوری کا بھی اندازہ تھا۔ گویا وہ چرب زبانی اور عیاری سے کام لے کر اس گوہر نایاب کو کوڑیوں کے مول خرید کر چند برسوں بعد موتیوں کی قیمت میں بیچ سکتا ہے۔ سو اس نے چند سو دینار کے عوض شمس الدین کو خرید لیا اور اپنے ساتھ لئے غزنی کیلئے روانہ ہو گیا۔

شمس الدین بخارہ سے دور ہونے اور اپنے اہل خانہ سے بچھڑنے پر سخت رنجیدہ تھا مگر چہرے سے ہرگز ظاہر نہ ہونے دیتا تھا، اس کا نیا آقا حاجی بخاری جو اسے افسردہ دیکھتا تو بے حد خفگی کا اظہار کرتا۔

"اس صد جہان کے غم میں گھل رہا ہے جس نے تجھے چند سو دینار کے عوض فروخت کر دیا؟" شمس الدین کوئی جواب نہ دیتا محض پلکیں جھپک جھپک کر آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پینے کی کوشش میں لگ جاتا۔

حاجی بخاری ایک ترش مزاج، غصیلے اور سخت گیر انسان تھا، غلاموں کے ساتھ سختی درشتی اور بے رحمی کے ساتھ پیش آنا اس کی فطرت کا خاصہ تھا، ذرا ذرا سی بات پر وہ اپنے غلاموں کو سخت سزائیں دیتا اور اکثر انہیں جانوروں کی طرح پیٹا کرتا تھا۔

شمس الدین ایک کم سخن، فرمانبردار اور خدمت گزار غلام تھا۔ وہ رات دن اسے کسی نہ کسی کام میں جتائے رکھتا اور شمس الدین حرف شکایت لبوں پر لائے بغیر کام میں لگا رہتا۔ پورے دن میں محض فرض نماز کی ادائیگی کیلئے اور رات کو تہجد کی نفل کیلئے اسے وقفہ درکار تھا۔ حاجی بخاری اس کی باجماعت فرض نماز کی ادائیگی کی اس عادت سے سخت نالاں تھا اور اکثر اسے برا بھلا کہتا رہتا تھا۔ شمس الدین اس کی ہر بات خاموشی سے سن لیتا تھا مگر اذان کی آواز سنتے ہی مسجد کی طرف چل دیتا تھا، ہزاروں سختیوں کے باوجود آج تک کبھی اس کی نہ ایک فرض نماز قضا ہوئی تھی، نہ ہی تہجد کے نفل ادا ہونے سے رہے تھے۔

ایک شام وہ تیزی سے مغرب کی نماز کی ادائیگی کیلئے مسجد کی جانب جا رہا تھا کہ حاجی بخاری نے اسے روکتے ہوئے سخت لہجے میں کہا تھا۔ "پہلے یہ کام مکمل کرو پھر نماز کیلئے جانا۔"

شمس الدین نے نگاہ اٹھا کر حاجی بخاری کی طرف دیکھا اور ٹھہرے ہوئے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "آقا! جس طرح آپ کا ہر حکم بجالانا میرا فرض ہے، اسی طرح اس حقیقی آقا کے حضور سجدہ ریز ہونا بھی مجھ پر لازم ہے.....میں نے آپ کے حکم کی بجا آوری میں کبھی کوتاہی نہیں کی.....آئندہ بھی کبھی کوئی کوتاہی نہیں ہوگی، بس آپ سے التماس ہے کہ مجھے اپنے رب کی بندگی سے سرتابی پر مجبور نہ کیجئے گا۔"

ننھے شمس الدین کے لہجے میں جانے ایسی کیا بات تھی کہ اس کے بعد حاجی بخاری نے اسے کبھی عبادت و ریاضت سے نہیں روکا۔

یہ دور شمس الدین کی زندگی کا سخت ترین دور تھا۔ حاجی بخاری اپنے دیگر غلاموں کی طرح اس سے بھی جانوروں کی طرح کام لیتا اور انہیں ناکافی خوراک دیتا، ذرا ذرا سی بات پر گالم گلوچ کرتا اور کوڑوں سے پٹائی کرتا۔

اس شام حاجی بخاری کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ پیٹ میں سخت اینٹھن اور تکلیف تھی، دیرینہ قبض کے باعث آنتوں میں سدے پڑ گئے تھے، حکیم نے اس کیلئے تازہ انگور تجویز کئے تھے۔ سو اس نے شمس الدین کو بلا کر ایک قراضہ کا سکہ اسے تھماتے ہوئے بازار سے انگور لانے کا حکم دیا تھا۔

شمس الدین سکہ ہاتھ میں دبائے بازار کی سمت چل دیا۔

دور مغربی پتھریلی چٹانوں کی اوٹ سورج غروب ہونے کو تھا۔ شفق کی سرخی نے آسمان کی نیلاہٹوں کو چھپا لیا تھا، اس کا ذہن نماز کی طرف لگا ہوا تھا، جانے کب سکہ اس کے ہاتھ سے پھسل گیا اور اسے پتہ بھی نہ چلا۔

انگور والے کے پاس پہنچ کر اس نے مٹھی کھولی تو سکہ نہ پا کر اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ حاجی بخاری کے غصے اور مار پیٹ سے زیادہ اسے اس بات کا ملال تھا کہ انگور نہ ملنے کے باعث اس کی تکلیف دور نہ ہوگی۔

شمس الدین وفور ملال سے رونے لگا۔ تب ہی قریب سے گزرتا ہوا ایک درویش صفت شخص رک گیا۔ اس نورانی صورت باریش بزرگ نے شمس الدین کی طرف دیکھا پھر کچھ اور قریب آ کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "محض ایک سکہ کھو جانے پر رو رہے ہو؟"

"آقا کو انگور نہ ملے تو ان کی طبیعت ٹھیک نہ ہوگی۔" شمس الدین نے ہچکیوں کے دوران جواب دیا۔ "میری ذرا سی غفلت کے باعث وہ کتنی تکلیف اٹھا رہے ہیں، حکیم نے انہیں انگور کھانے کو کہا ہے۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" درویش مسکرایا۔ "انگور ہم تمہیں خرید دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر درویش نے انگور کا ایک بڑا خوشہ خرید کر شمس الدین کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "لو یہ انگور لے کر فوراً روانہ ہو جاؤ ورنہ تمہاری مغرب کی نماز قضا ہو جائے گی۔"

"مگر میں آپ سے یہ انگور کس طرح لے سکتا ہوں؟" شمس الدین نے تذبذب کے عالم میں کہا۔ "ان کے عوض آپ کو دینے کیلئے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"تو ٹھیک ہے بعد میں دے دینا۔" درویش کے باریک لبوں پر مسکراہٹ کی لو ٹمٹمائی اور سفید داڑھی سے آراستہ چہرہ یکلخت نور بن گیا۔ وہ شمس الدین کے کچھ اور قریب کھسکتے ہوئے سرگوشی میں گویا ہوئے۔

"جب تخت سلطنت پر متمکن ہو جاؤ تو فقراء اور اہل خیر سے اچھا سلوک کرنا اور ان کے حقوق نگاہ میں رکھنا.....اب جاؤ ورنہ تمہارا آقا خفا ہوگا۔"

درویش کی باتیں شمس الدین کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ وہ محض سر ہلاتا ہوا گھر کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔ اس کیلئے یہی بہت کافی تھا کہ وہ اپنے آقا کیلئے انگور لانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس کی گالم گلوچ اور مار پیٹ سے بچ گیا تھا۔

وقت گزرتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے چھ برس بیت گئے۔

شمس الدین لڑکپن کی پگڈنڈی پر چلتا ہوا عنفوان شباب کی وادیوں میں داخل ہو گیا۔ اب وہ اٹھارہ برس کا ایک خوبرو نوجوان تھا، چودھویں کے چاند کی سی دمکتی اس کی کشادہ پیشانی، اس کی بلند بختی کی علامت تھی، اس کی بڑی بڑی سیاہ مسحور کن آنکھیں، جھیل کی طرح گہری، ہیرے کی طرح چمکدار اور شفاف تھیں، اس کے چہرے کا بھول پن اور نور اس کے اعلیٰ کردار کا آئینہ دار تھا۔

حسن صورت کے ساتھ وہ حسن سیرت سے بھی مالا مال تھا۔

اس شام حاجی بخاری کا ایک دیرینہ واقف کار حاجی جمال الدین چست قبا اس سے ملنے آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک انتہائی بدشکل غلام تھا جو اپنی بدہیتی، نقاہت کے باعث "ایبک" کے نام سے جانا جاتا تھا۔

حاجی بخاری، حاجی جمال الدین کے غلام کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔ "حاجی! تم بالوں اور داڑھی کو خضاب لگاتے ہو، عمدہ ملبوسات زیب تن کرنے کے باعث "چست قبا" کے لقب سے جانے جاتے ہو.....صاحب ثروت ہو اس کے باوجود تمہیں غلام خریدنے کی تمیز نہیں ہے؟"

"تمہیں تو جیسے بہت تمیز ہے۔" حاجی جمال الدین جل کر بولا۔ "ذرا میں بھی تو دیکھوں تمہارے پاس کیسے کیسے دُرِّ نایاب موجود ہیں۔"

"ہاں کیوں نہیں؟" حاجی بخاری نے مسکراتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا اور آواز دے کر شمس الدین کو بلایا۔

شمس الدین کے آتے ہی جیسے ہر سمت اجالا پھیل گیا تھا۔ کشادہ شانوں، بلند قامت، توانا، باوقار اور شاندار شمس الدین غلام سے زیادہ کسی سلطنت کا سلطان لگ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی حاجی جمال الدین کی چھوٹی چھوٹی چندی آنکھوں میں چمک جاگ اٹھی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شمس الدین کو حاجی بخاری سے خرید کر سلطان محمد غوری کے دربار میں منہ مانگی قیمت وصول کرے گا اور اس طرح بیٹھے بٹھائے زبردست منافع کمائے گا۔

"حاجی بخاری.....!" حاجی جمال الدین نے شمس الدین کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے حاجی بخاری کو مخاطب کیا۔ "میں تمہارا یہ غلام خریدنا چاہتا ہوں، اگر میرے غلام ایبک کے ساتھ یہ ہوگا تو شاید وہ بھی بک جائے گا، ورنہ اس کا بکنا محال ہے۔"

حاجی جمال الدین نے مسکین صورت بنا کر کہا تو حاجی بخاری بے اختیار ہنسنے لگا۔ تھوڑی رد و قدح کے بعد سودا طے پا گیا۔

اور حاجی جمال الدین، شمس الدین کو خرید کر اپنے گھر کیلئے روانہ ہو گیا۔ حاجی جمال الدین چست قبا ساٹھ باسٹھ سال کا سن رسیدہ شخص تھا مگر وہ خود پر خاص توجہ دیتا تھا، بالوں اور داڑھی کو خضاب سے رنگتا اور خوب عمدہ لباس زیب تن کرتا تھا، اس کی یکے بعد دیگرے تین بیویاں فوت ہو چکی تھیں، تین شادیاں کرنے کے باوجود وہ اب تک اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔

اولاد کی آرزو کی تکمیل کی خاطر حال ہی میں اس نے ایک 16 برس کی نوجوان لڑکی سے چوتھی شادی کی تھی۔

جب وہ شمس الدین کو ساتھ لئے گھر پہنچا تو اس کی حسین اور نوجوان بیوی ماہ پارہ نے حیران نظروں سے آنے والے اس حسین نوجوان کی طرف دیکھا جس کی نگاہیں نیچی اور سر جھکا ہوا تھا۔ نحیف و نزار غلام ایبک اور بوڑھے حاجی کے درمیان وہ بے حد منفرد و مختلف اور شاندار لگ رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے پر اشتیاق لہجے میں اپنے بوڑھے خاوند سے سوال کیا۔

"غلام ہے۔" حاجی جمال الدین نے جواب دیا۔ "تمہیں کمزور اور لاغر ایبک سے ہمیشہ یہ شکایت رہتی تھی کہ ذرا سے کام کے بعد وہ تھک کر ہانپنے لگتا ہے، اس لئے میں یہ جوان اور توانا غلام خرید کر لایا ہوں، اب تمہارے سارے کام یہی کرے گا، کنویں سے پانی اور بازار سے سودا سلف لائے گا اور گھر کے کاموں میں بھی تمہارا ہاتھ بٹائے گا۔"

"بہت خوب.....!" ماہ پارہ نے شمس الدین کا سرتاپا تحسین آمیز نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "دیکھنے میں تو کاہل اور کام چور نہیں لگتا۔"

"کاہل اور کام چور.....؟" حاجی جمال الدین جلدی سے بولا۔ "اس کا سابقہ آقا حاجی بخاری انتہائی بخیل اور کمینہ آدمی ہے.....کسی کی تعریف بہت ہی مشکل سے کرتا ہے مگر وہ اس کی بے حد تعریف کر رہا تھا.....وہ تو اس کو بیچنے کو تیار ہی نہیں تھا.....بڑی مشکل سے میں نے اسے راضی کیا۔"

"یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔" ماہ پارہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "ایسے توانا، خوبرو اور شاندار غلام کہاں ملتے ہیں۔"

"وہی تو۔" حاجی جمال الدین چہک کر بولا۔ "کچھ دنوں بعد میں اسے فروخت کر دوں گا اور مجھے یقین ہے کہ اس سودے میں مجھے بے حد فائدہ ہوگا۔" اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے لالچ جھانک رہی تھی۔

مگر ماہ پارہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

اس حسین و جمیل، باوقار اور شاندار نوجوان کو دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ وہ ایک مفلس گھرانے کی لڑکی تھی، اس کے والدین نے ایک بڑی رقم کے عوض اسے حاجی جمال الدین جیسے بوڑھے شخص کے حوالے کر دیا تھا، دو سال سے وہ اس کے ساتھ ایک محروم، بے رنگ اور ناآسودہ زندگی گزار رہی تھی، آج شمس الدین جیسے وجیہ جوان کو دیکھ کر اس کی مایوس آنکھوں میں امید کی قندیلیں جل اٹھی تھیں اور اس کے دل کی بے رنگ دنیا میں دھنک رنگ سوچیں معطر اور شاداب غنچوں کی طرح یہاں وہاں چٹکنے لگی تھیں اور کتنے ہی ان دیکھے اور انوکھے سپنے اس کی گھنی پلکوں کی باڑھ سے آ لگے تھے۔ شمس الدین کے تصور کا چھینٹا پا کر ہی اس کے جلتے بدن میں ٹھنڈک سی پھیل گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

یونہی خاموشی اور آہستگی سے کئی روز بیت گئے۔

حاجی جمال الدین کسی کام سے گھر سے باہر جاتا تو شمس الدین کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ راہ چلتے لوگ رک رک کر اور پلٹ پلٹ کر جب اس کے حسین و رعنا غلام کو دیکھتے تو اسے اپنے دل میں ایک فخر و غرور کا احساس جاگتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ شمس الدین ہر لحاظ سے ایک بہترین غلام تھا، اب تو کبھی کبھی اس کے دل میں اسے فروخت کرنے کے ارادے کو ترک کرنے کا خیال بھی آنے لگا تھا۔

شمس الدین گھر میں ہوتا تو سارا وقت وہ ایبک کے ساتھ نتھی رہتا۔ وہ زیادہ تر باہر کے کام نمٹاتا تھا، کنویں سے پانی بھر کر لاتا، اصطبل کی صفائی اور گھوڑے کی دیکھ بھال کرتا اور بازار سے سودا سلف خرید کر لاتا۔

ماہ پارہ کے سینے میں چلتے طوفانوں کو کوئی کنارہ نہ ملتا تھا۔ دل میں کروٹیں لیتی امنگوں کی تکمیل کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، کوئی امید بر نظر نہ آتی تھی۔

وہ جس قدر شمس الدین کی قربت چاہتی تھی، وہ اسی قدر اس سے دور دور اور کنارہ کش رہتا تھا۔ اس کا گریز اور اجتناب ماہ پارہ کے شوق طلب کو اور بھڑکا رہا تھا۔

"کیا واقعی تم اتنے سادہ ہو کہ کچھ نہیں سمجھتے یا کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتے؟" موسم سرما کی اس سرد اور سرمئی شام میں وہ دونوں اصطبل سے باہر آڑو کے پیڑوں سے گرنے والے خشک پتوں اور ٹہنیوں کو جلا کر الاؤ کے گرد بیٹھے ہاتھ تاپ رہے تھے۔ تب ہی اس کے ساتھی غلام ایبک نے اسے مخاطب کر کے پوچھا تھا۔

"کیا مطلب.....؟" شمس الدین نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پلکیں اٹھائیں۔

"مالکن تم پر بے حد مہربان ہے۔" ایبک اس کے قریب کھسکتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ "کیا تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہے؟"

"حاجی بخاری کے گھر سے پہلے میں جس گھر میں رہتا تھا، اس گھر کی مالکن مجھ پر ماں کی طرح مہربان تھی۔" شمس الدین کی اداس آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ "اس محبت کا شاید تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔"

"شمس الدین! ذرا میری چلم بھر دو۔" اس سے قبل کہ ایبک اس کی بات کا کوئی جواب دیتا یا اس کے جواب پر اپنا سر پیٹتا، دریچہ کھول کر حاجی جمال الدین نے شمس الدین کو آواز دے لی تھی اور وہ تیزی سے اٹھ کر اندر کی طرف چلا گیا تھا۔

اگلی دوپہر حاجی جمال الدین دوپہر کے کھانے کے بعد اپنی خواب گاہ میں قیلولہ کر رہا تھا۔ شمس الدین اس کی چلم بھرنے کیلئے باورچی خانے کی طرف گیا تو موقع غنیمت جان کر ماہ پارہ بھی اس کے پیچھے باورچی خانے میں آگئی تھی۔

"شمس الدین! مجھ سے اتنے گریزاں کیوں رہتے ہو؟" اس نے سلگتے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔

"جی.....؟" شمس الدین نے حیرت سے پلکیں جھپکی تھیں مگر نگاہ نہیں اٹھائی تھی۔

"ایک بار نگاہ بھر کر میری طرف دیکھو تو.....!" ماہ پارہ اس کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی۔ "مانا کہ تم ایک شاندار اور طاقتور جوان ہو مگر میں بھی کچھ کم نہیں ہوں، ہزاروں میں نا سہی پر سیکڑوں میں ایک ضرور ہوں۔"

"براہ کرم مجھے جانے دیجئے، آقا اپنی چلم کا انتظار کر رہے ہوں گے۔" شمس الدین نے ہراساں لہجے میں جواب دیا اور باورچی خانے کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"اور میں جو ہفتوں سے تمہاری توجہ اور التفات کا انتظار کر رہی ہوں؟" ماہ پارہ نے لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب.....؟" شمس الدین اس طرح کی باتوں اور جذبوں سے قطعاً نابلد تھا۔

"میری طرف دیکھو شمس!" ماہ پارہ کچھ اور قریب آتے ہوئے جذبات بھری سرگوشی میں گویا ہوئی۔ "یہ حسین جسم، یہ ارمانوں بھرا دل اور حسین سپنوں سے سجی یہ خوابناک آنکھیں.....سب تمہاری منتظر ہیں.....یہ سب کچھ تمہارے لئے ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔" شمس الدین جھنجھلا کر پرے ہٹتے ہوئے بولا۔ "آپ کس طرح کی باتیں کر رہی ہیں.....میں ان باتوں کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"میں تمہیں سب سمجھا دوں گی۔" ماہ پارہ سرگوشی میں بولی۔ "تم سامنے والے کمرے میں چلے آؤ.....بوڑھا جمال الدین اونگھ گیا ہوگا.....جاگے بھی تو موٹے عدسوں کے پیچھے سے جھانکتی اس کی کمزور آنکھیں ہمیں نہیں دیکھ سکیں گی۔"

"لیکن شاید آپ ان کی آنکھوں کو بھول گئی ہیں۔" شمس الدین نے پیچھے ہٹتے ہوئے واضح اور پرتاثیر آواز میں جواب دیا۔ "جو ہر جگہ موجود ہیں اور سب کچھ دیکھ سکتی ہیں، ان آنکھوں کی نہ بینائی کم ہے، نہ انہیں اونگھ آتی ہے.....اس رب دو جہاں کی موجودگی میں کوئی گناہ کے بارے میں سوچ بھی کس طرح سکتا ہے؟ اگر آپ گناہ کرنا چاہتی ہیں تو اس کی زمین اور آسمان کی حدود سے نکل جائیے اور کسی ایسی جگہ چلی جائیے جہاں اس کی آنکھیں آپ کو گناہ کرتے نہ دیکھ سکیں، کیا آپ ایسا کر سکیں گی؟"

شمس الدین نے نگاہ اٹھا کر ماہ پارہ کی طرف دیکھے بنا واپسی کیلئے قدم بڑھا دیئے اور وہ اپنی جگہ پتھر کی بے جان مورتی کی طرح کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

شمس الدین ہاتھ میں چلم لئے حاجی جمال الدین کی خواب گاہ میں آیا تو اس نے دیکھا۔ اس کا بوڑھا آقا چلم کی راہ دیکھتے دیکھتے سو چکا ہے، اس کا منہ ذرا سا کھلا ہوا تھا اور سامنے کے ٹوٹے ہوئے دو دانت غار کا سا منظر پیش کر رہے تھے، اس کے پچکے گالوں اور جھریوں بھرے چہرے پر خضاب سے رنگی شب دیجور کی طرح سیاہ داڑھی عجب منظر پیش کر رہی تھی۔ وہ چلم کو پلنگ کے نزدیک رکھ کر خود اصطبل کے کونے میں واقع ایبک کی کوٹھری میں چلا آیا۔

"کیا بات ہے، بہت ہراساں لگ رہے ہو؟" اس کے چہرے پر پھیلے استعجاب اور اضمحلال کے سائے دیکھ کر ایبک نے پریشان لہجے میں سوال کیا۔

تب اس نے سر جھکا کر سب باتیں اس کے گوش گزار کر دیں۔

"مالکن کی آنکھوں میں تمہارے لئے پسندیدگی تو میں روز اول سے دیکھ رہا ہوں.....حیرت ہے کہ تمہیں آج پتہ چلا؟"

"ایبک! ایسی باتیں سوچنا بھی گناہ ہے۔" ایبک کی بات پر وہ جز بز ہو کر بولا۔ "ہمارا دین ہمیں سکھاتا ہے کہ ہمیں اپنی شرم گاہوں کی ہی نہیں، اپنی آنکھوں اور اپنی سوچوں کی بھی حفاظت کرنی چاہئے۔"

"مالکن کی اس گناہ آلود سوچ کے پیچھے آقا کی زیادتی بھی شامل ہے۔" ایبک نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "بھلا آقا کو اس عمر میں کسی نوعمر اور نوخیز لڑکی سے بیاہ رچانے کی ضرورت کیا تھی، اسے پیاسا اور تشنہ سونے کے پنجرے میں بند کر کے رکھ چھوڑا ہے، وہ اپنے برانگیختہ جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اگر کسی گناہ کی مرتکب ہوگی تو اس گناہ کی سزا اس کے شوہر کو بھی ملنی چاہئے۔"

"میں تمہارے اس فلسفے کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔" شمس الدین نے ہاتھوں میں سر تھامتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟"

"سوال یہ نہیں ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟" ایبک نے سر اٹھا کر پرسوچ لہجے میں جواب دیا۔ "اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا کرتی ہے؟"

☆.....☆.....☆

وہ شمس الدین کے جانے کے بعد کافی دیر تک اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑی رہی تھی، پھر جیسے وہ ہوش میں آگئی تھی۔ رگوں میں دوڑتی سیال آگ نے اس کے تن بدن کو جھلسا کر رکھ دیا تھا، امیدیں اور امنگیں دم توڑ چکی تھیں، اس کے جذبات اور التفات کو اس نے کس سنگدلی اور بے رخی سے ٹھکرا دیا تھا، اس کے کھلے بازو اور پھیلا دامن اس نے کس بیدردی سے جھٹکا تھا کہ اس کا امنگوں بھرا دل لہولہو ہو گیا تھا۔ نارسائی اور ٹھکرائے جانے کا رنج قطرہ قطرہ زہر کی صورت اس کی نس نس میں اترتا جا رہا تھا، اشتہا کی جگہ اشتعال جاگ اٹھا تھا اور دل کے گوشے گوشے میں پھیلی پیاسی محبت پر نفرت اور انتقامی جذبات حاوی ہوتے جا رہے تھے۔

ایک معمولی زر خرید غلام نے اس کی گزارش کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس کے دست طلب کو جھٹک دیا تھا.....اب وہ اسے بتائے گی کہ اسے ٹھکرانے کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔

اس نے جھک کر قریب دھری چھری اٹھا لی پھر چھری سے اپنا گریبان چاک کر لیا اور دامن پھاڑ لیا اور بازو اور سینے پر خراشیں ڈال لیں اور روتی اور چیختی ہوئی حاجی جمال الدین کے کمرے کی طرف دوڑی۔

"تم یہاں خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہو اور وہ دو کوڑی کا غلام تمہاری عزت سے کھیلنے کے درپے ہے۔" اس نے بوڑھے حاجی کو جھنجھوڑتے ہوئے فریاد کی۔

"کیا ہوا.....کیا ہوا؟" حاجی ہڑبڑا کر اٹھا اور بیوی کی لٹی پٹی حالت حیرت سے دیکھنے لگا۔ "یہ سب کیا ہے؟"

"تمہارے اس غلام نے میری عزت لوٹنے کی کوشش کی ہے۔" ماہ پارہ نے روتے ہوئے بتایا۔ "یہ دیکھو.....یہ میرا چاک گریبان اور یہ پھٹا ہوا دامن.....!"

"کیا ایبک کی حرکت ہے؟" جمال الدین نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" ماہ پارہ نے نفی میں زور زور سے سر ہلاتے ہوئے پرزور لہجے میں جواب دیا۔

"ایبک نے نہیں.....اس بدبخت شمس الدین نے.....!"

حاجی جلال الدین کی پوری آنکھیں کھل گئیں، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر خون اترنے لگا تھا۔

(جاری ہے)

صفحہ نمبر:......1

''لو یہ چھری اور جا کر اُسکے ٹکڑے کردو۔'' ماہ پارہ نے لباس میں چھپائی ہوئی چھری نکال کر حاجی جمال الدین کے حوالے کرتے ہوئے طیش دلانے والے انداز میں کہا۔

حاجی نے بلاسوچے سمجھے چھری پکڑلی اور تیزی سے کمرے سے نکل کر اصطبل میں بنی کوٹھری کی طرف بھاگا۔



شمس الدین اس وقت نوافل کی ادائیگی میں مصروف تھا۔ اس کے پر نور چہرے پر اطمینان بکھرا ہوا تھا۔ وہ دنیا ومافیہا سے بے خبر مالکِ حقیقی کے حضور سربہ سجود تھا۔ اُسے دیکھ کر حاجی جمال الدین کے ہاتھ سے چھری گرگئی اور وہ وہیں اصطبل کے دروازے پر بیٹھ گیا اور اشارے سے ایبک کو اپنے پاس بلایا اور اس سے احوال معلوم کیا۔

ایبک نے پوری سچائی سے تمام حال کہہ سنایا۔ ماہ پارہ کے انداز، اطوار سے جھلکتی لگاوٹ اُسے بھی محسوس ہوئی تھی مگر اس نے اس بات کو نظر انداز کردیا تھا۔ اب فیصلے کی گھڑی آ گئی تھی...... ایک موٹی رقم ادا کرکے اس نے ماہ پارہ سے شادی کی تھی۔ اس بڑھاپے میں وہ اکیلے رہنے کے تصور سے ہی خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ وہ جیسی بھی تھی زندگی کے آبلہ پا سفر میں اس کی ہم سفر تھی۔

اب سوال یہ تھا کہ اس مشکل کا کیا حل ہو...... سو وہ کچھ دیر اس مسئلے پر غور کرتا رہا، آخرکار ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ وہ آہستہ روی سے چلتا کوٹھری میں داخل ہوا، شمس الدین نوافل ادا کرکے سلام پھیر رہا تھا۔ اس کے فارغ ہوتے ہی، حاجی نے بلاتمہید اپنا فیصلہ سنایا۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اب تمہیں فروخت کردوں گا۔''

''یہی بہتر ہوگا۔'' شمس الدین نے سنجیدہ لہجے میں اس کے فیصلے کی توثیق کی۔ ''آپ کے حق میں بھی اور میرے حق میں بھی۔''

حاجی کے فیصلے کی خبر ماہ پارہ کو ہوئی تو اسکا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔ اُسے اپنی بے وقوفی پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ انجانے میں اپنے پیروں پر خود ہی کلہاڑی مار بیٹھی تھی۔ اگر آج شمس الدین نہیں مانا تھا تو...... اُسے دوبارہ...... کوشش کرنی چاہیے تھی۔ قطرہ قطرہ پانی ٹپکتے رہنے سے پتھر میں بھی شگاف پڑ جاتا ہے...... وہ تو ایک نوجوان لڑکا تھا، مگر اس کی جلد بازی نے سب کام خراب کردیا تھا...... ابھی تو اس نے سوچوں کی سنہری پوروں سے خواب ریزے چننے کا آغاز بھی نہیں کیا تھا کہ خواب ریت کی صورت اس کی مٹھی سے پھسلنے لگے تھے۔

اسی شام حاجی جمال الدین، شمس الدین اور ایبک کو لے کر گھر سے روانہ ہوگیا، جب وہ بازار میں داخل ہوا تو حسب معمول لوگ شمس الدین کو پلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے تھے۔ کافی دیر تک وہ ان دونوں کو لئے بازار میں بلا مقصد ہی گھومتا رہا۔ شمس الدین کی جانب اٹھتی لوگوں کی ستائش بھری نظروں نے حاجی جمال کی لالچ میں اضافہ کردیا تھا۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ وہ اُسے بازار میں فروخت کرکے واپس لوٹ آئے گا...... مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ اُسے محمد غوری کے دربار میں پیش کرے اور ایسے دُرِ نایاب کی منہ مانگی قیمت حاصل کرے۔

سو اگلے دن صبح صبح وہ شمس الدین اور ایبک کو لے کر سلطان شہاب الدین محمد غوری کے دربار میں حاضر ہوا۔

محمد غوری معرکۂ گجرات میں مات کھا کر واپس لوٹا تھا۔

راجہ بھیم دیو اور والیٔ گجرات کے درمیان سلطان محمد غوری کے خلاف ایک معاہدہ طے پایا تھا، اس طرح راجہ بھیم دیو نے ملاحدہ کی امداد پاکر، محمد غوری کے مقرر کردہ حاکم علی کرماخ سے سندھ اور ملتان چھین لینے کی تیاری کی یہ خبر سن کر شہاب الدین محمد غوری غزنی سے براستہ ملتان گجرات کے لئے روانہ ہوا تھا۔

یہ 1178ء کے موسم گرما کا آغاز تھا۔ اس سفر میں سلطان محمد غوری سے ریگستان کی صعوبتوں اور پانی کی دستیابی اور بھیم دیو کی جنگی طاقت کا اندازہ لگانے میں غلطی ہوئی تھی۔ جب وہ گجرات کے نزدیک پہنچا تو اس کی فوج کا ایک بڑا حصہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے راستے میں ہلاک ہو چکا تھا۔ اس حالت میں بھیم دیو نے سلطان کی تھکی ماندی اور نہایت قلیل فوج کو دم لینے اور سستانے کی مہلت نہ دیتے ہوئے حملہ کردیا اور سلطان محمد غوری کو گجرات سے بلاحصول مقصد واپس لوٹنا پڑا...... اس شکست نے اسے بے حد غضب ناک اور خونخوار کردیا تھا۔ وہ بات بات پر مشتعل ہو جاتا تھا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر لوگوں کو بڑی بڑی سزائیں دے رہا تھا۔ شکست کی تلخی نے اس کے پورے وجود کو کڑواہٹ سے بھر دیا تھا۔

حاجی جمال الدین حالات سے بے خبر اگلے دن اپنے دونوں غلاموں شمس الدین اور ایبک کو لے کر اس کے دربار میں حاضر ہوا۔

''ہوں، بولو؟'' شہاب الدین غوری نے حاجی جمال کے حریص چہرے پر نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔

''سلطانِ معظم! میں فروخت کے لئے آپ کے پاس یہ نایاب ہیرا لے کر آیا ہوں۔'' حاجی نے خوشامد بھرے لہجے میں شمس الدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہیرا......'' محمد غوری نے نگاہ بھر کر شمس الدین کی طرف دیکھا۔ پھر حاجی کو مخاطب کرکے ترش لہجے میں بولا۔ ''اگر یہ ہیرا ہے تو، تو اسے یہاں کیوں لایا ہے؟ تجھے اسے، کسی جوہری کے پاس لے کر جانا تھا۔''

''آپ سے بڑا جوہری اور کون ہو سکتا ہے؟'' حاجی جمال الدین نے آگے بڑھ کر سلطان کے ہاتھ کی پشت کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی جوہر شناس نگاہیں، ہی اس ہیرے کی قدر جان سکتی ہیں۔''

سلطان محمد غوری نے گردن کو ذرا خم دے کر شمس الدین کی طرف دیکھا۔ وہ نگاہیں نیچی کئے سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ ایک مضبوط قد کاٹھ کا وجیہہ نوجوان تھا۔ اس کی جھکی نگاہوں کی حیا اور چہرے پر بکھرا نور اس کے خاندانی اور باکردار ہونے کا غماز تھا۔ سلطان کئی لمحوں تک اُسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے جھانکتی دلچسپی اور پسندیدگی حاجی کی جہاں دیدہ نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی۔ فرطِ مسرت سے اس کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔

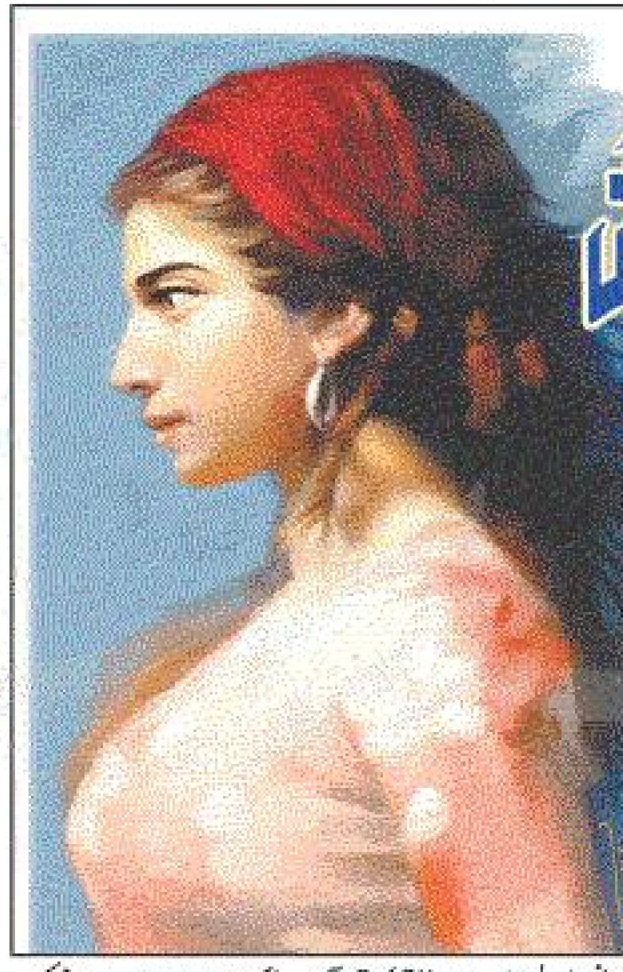
''ہوں۔'' چند لمحوں بعد سلطان نے سوالیہ نظروں سے حاجی کی طرف دیکھا۔ ''بولو! کیا قیمت لگاتے ہو؟''

''سلطانِ معظم۔'' حاجی جلدی سے چاپلوسی بھرے لہجے میں گویا ہوا۔ ''میرے اختیار میں ہوتا تو یہ دُرِنایاب میں آپ کی خدمت میں تحفتاً پیش کردیتا...... مگر افسوس آج کل میں مالی بحران کا شکار ہوں، اسی واسطے اسے بیچنے پر مجبور ہوں۔''

''قیمت لگاؤ؟'' سلطان اس کی اس بے مقصد اور لایعنی تمہید سے اوب کر بولا، سلطان کو انسانوں کی زبردست پرکھ تھی، وہ حاجی کو دیکھتے ہی اس کی لالچی اور حریص طبیعت کا اندازہ لگا چکا تھا اور جب حاجی نے قیمت بتائی تو اس کے اندازے کی تصدیق بھی ہوگئی تھی۔

''یہ قیمت تو بہت زیادہ ہے۔'' سلطان نے ناپسندیدہ لہجے میں کہا۔ ''تو غلام بیچنے آیا ہے یا سلطان......؟''

''سلطانِ معظم! کون جانے آج کا یہ غلام کل کا سلطان ہو۔'' حاجی نے بے سوچے سمجھے کلمہ لگا دیا تھا جو سلطان کو سخت ناگوار گزرا تھا۔ وہ



غصیلے لہجے میں بولا۔ ''تو پھر تو یہ سمجھ لے کہ تیرا یہ غلام اس پوری مملکت میں کہیں نہیں بکے گا...... کیونکہ یہاں غلاموں کی بولی لگتی ہے، سلطانوں کی نہیں...... قسم ہے اس پیدا کرنے والے کی...... تو اسے غزنی سے بخارا تک اس پورے علاقے میں کہیں بھی نہ بیچ سکے گا......''

''مگر...... مگر سلطان معظم...... میں......'' حاجی نے گڑبڑا کر جلدی سے اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہی۔

''بس۔'' سلطان نے ہاتھ اٹھا کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اب تو جا سکتا ہے۔'' پھر وہ اپنے وزیر سے مخاطب ہوا۔ ''پوری سلطنت میں منادی کروادو کہ کوئی اس لالچی اور حریص حاجی کے اس غلام کو نہ خریدے۔''

''سلطانِ معظم...... رحم......'' حاجی نے گڑگڑا کر رحم کی درخواست کرنا چاہی مگر سلطان کے خدام اُسے گھسیٹتے ہوئے دربار سے باہر لے چلے تھے۔

''شکر کر کہ تیری جان بچ گئی۔'' ایک خادم نے اُسے دروازے سے باہر پٹختے ہوئے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''ورنہ تیری حرکت تو ایسی ہی تھی کہ تیرا سر قلم کردیا جاتا۔''

وہ کیا کیا امیدیں لے کر آیا تھا، مگر سودے کے آغاز میں ہی اس ناخوشگوار واقعے سے سخت ناخوش اور کبیدہ خاطر تھا۔ وہ شام تک ان دونوں کو لے کر غزنی کے تمام بازاروں میں گھومتا رہا۔ لوگ شمس الدین کو دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتے مگر جونہی انہیں سلطان کے حکم کا علم ہوتا وہ پیچھے ہٹ جاتے۔

ہفتہ بھر غزنی کے کوچہ و بازار میں گھومنے کے بعد حاجی جمال الدین کو اچھی طرح اندازہ ہی نہیں بلکہ یقین بھی ہوگیا تھا کہ اس شہر میں شمس الدین کا بکنا ممکن نہیں ہے، سو وہ شمس الدین اور ایبک کو لے کر بخارا کے لئے روانہ ہوگیا۔

مہینہ بھر وہ بخارا کے بازاروں کی خاک چھانتا رہا مگر اُسے شمس الدین کا کوئی بھی خریدار نہ ملا۔ مہینے بھر کی اس خواری نے اُسے سخت عاجز اور بیزار کردیا تھا۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاہٹ اور غصہ بڑھ گیا تھا۔

''مجھے معلوم ہوتا تو میرے لئے سانپ کی منہ کی چھچھوندر بن جائیگا...... تو میں تجھے حاجی بخاری سے خریدنے کی کبھی حماقت نہ کرتا۔'' وہ بات بے بات شمس الدین کو طعنے دینے بیٹھ جاتا۔ ''کم بخت کی شکل وصورت جس قدر اچھی ہے قسمت اُسی قدر خراب ہے۔''

شمس الدین حسب عادت جواب دیئے بنا خاموشی سے اپنے آقا کے پیر دباتا رہا۔ اس وقت وہ تینوں ایک گھنے پیڑ کی چھاؤں میں ایک چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چلتے چلتے حاجی کے پیر درد کرنے لگے تھے، سو اس نے شمس الدین کو پیر دبانے کا حکم دیا تھا، وہ مسلسل اسے کھری کھوٹی سنائے جا رہا تھا۔

''ذرا مجھے پانی پلا۔'' اس نے ایبک کو حکم دیا۔ ایبک نے اٹھ کر مشکیزہ ہلا کر دیکھا مگر وہ خالی تھا۔ ''آقا پانی ختم ہو چکا ہے...... اور ہمیں علم نہیں کہ اس علاقے میں کنواں کس طرف ہے؟''

''شمس الدین جا، کنواں کھوج کر مشکیزہ بھر کر لا۔'' حاجی جمال الدین نے کڑوے لہجے میں اسے حکم دیا اور وہ فوری طور پر حکم کی بجا آوری کے لئے مشکیزہ لے کر تلاشِ چاہ میں نکل کھڑا ہوا۔

مختلف لوگوں سے پوچھتا آخر کار گھنٹے بھر کی مسافت کے بعد وہ ایک کنویں پر پہنچ گیا۔ ابھی وہ کنویں کی منڈیر کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک شخص نے اسے مخاطب کرکے پوچھا کہ کیا اُس نے کنویں کے مالک سے پانی بھرنے کی اجازت لے لی ہے۔

''نہیں تو۔'' شمس الدین نے رکتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس کنویں کا مالک کون ہے...... اور میں کیونکر اس سے اجازت لے سکتا ہوں، براہ کرم میری رہنمائی فرمایئے۔''

''یہ کنواں، سلطان کے ایک غلام قطب الدین ایبک کا ہے جو آج کل ہندوستان میں سلطان کی فوجوں کی سپہ سالاری کرتا ہے...... اگر اتفاق سے وہ کبھی اس جانب آ نکلے تو تم اس سے اجازت لے سکتے ہو......'' لحظہ بھر کو رک کر وہ شوخ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ورنہ اور لوگوں کی طرح تم بھی خاموشی سے پانی بھر کر جا سکتے ہو......''

''نہیں۔'' شمس الدین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اگر یہ طے ہے کہ مالک سے اجازت لی جائے تو پھر اجازت کے بغیر پانی لینا جائز نہیں ہے...... میں کوئی اور کنواں تلاش کرلونگا۔''

وہ اپنا مشکیزہ بغل میں دبائے واپسی کے لئے مڑ گیا۔

ذرا فاصلے پر ایک پیڑ تلے کھڑا ایک ادھیڑ عمر شخص اُسے حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا، اس کی دیانت داری نے اسے متاثر کیا تھا، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُسکے پیچھے لپکا۔

''اے بندۂ خدا! ذرا رکنا تو۔'' اس نے اسے پکارا۔

''جی۔'' شمس الدین اس کی آواز سنکر فوراً ہی پلٹ آیا تھا۔ ''آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟'' اس نے اپنے پیچھے آتے ہوئے اس باوقار اور معتبر شخص سے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ شخص قریب آ کر رک گیا اور اب غور سے شمس الدین کو دیکھ رہا تھا۔ ''میں تمہارے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔''

''میرا نام شمس الدین ہے...... اور میں غزنی کے ایک معزز شخص حاجی جمال الدین چست قبا کا غلام ہوں۔'' شمس الدین نے نظریں جھکا کر اپنا تعارف کروایا۔

''اور میرا نام قطب الدین ایبک ہے۔'' نووارد اپنائیت بھرے انداز میں مسکرایا۔ ''یہ کنواں میرا ہے...... اور میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ آپ اس کنویں سے اپنا مشکیزہ بھرلو۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' شمس الدین نے ممنون لہجے میں جواب دیا اور سلام کرتا ہوا کنویں کی طرف بڑھ گیا۔

قطب الدین کو اس کی دیانت داری، شائستگی اور سب سے بڑھ کر وجاہت نے بے حد متاثر کیا تھا۔ اس کے دل میں اس نادرروزگار غلام کو خریدنے کی خواہش جاگ اٹھی تھی۔ مگر وہ سلطان کے حکم سے بھی واقف تھا۔ اس لئے سلطان کی اجازت کے بغیر اسے خریدنا ناممکن تھا۔

سو وہ سلطان کے دربار میں حاضر ہوا اور اس نے شمس الدین کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا اور بصد احترام اس سے اجازت چاہی۔

''کیونکہ میں پروردگار کی قسم کھا کر کہہ چکا ہوں، کہ حاجی جمال کے اس غلام کو اس پوری سلطنت میں کوئی، کسی بھی قیمت پر نہیں خریدے گا...... اس لئے میں تجھے، اسے یہاں خریدنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ البتہ تیری خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے میں تیرے لئے اتنا کرسکتا ہوں کہ تو اسے اور اس کے مالک کو اپنے ساتھ ہندوستان لے جا، پھر وہاں پہنچ کر اسے خرید لینا۔''

حاجی جمال الدین دو دن کی خواری سے سخت عاجز آ چکا تھا، چنانچہ قطب الدین کے کہنے پر وہ ہندوستان چلنے پر آمادہ ہوگیا۔

ہندوستان پہنچ کر سلطان قطب الدین ایبک نے دونوں ترک غلاموں یعنی شمس الدین اور ایبک کو معقول رقم دے کر خرید لیا۔ حاجی جمال الدین چست قبا رقم کھری کرکے غزنی کے لئے روانہ ہوگیا۔

قطب الدین ایبک نے، شمس الدین کے ساتھی غلام، ایبک کا نام تبدیل کرکے طغاج رکھ دیا اور تعلیم وتربیت کے لئے اُسے بھٹنڈا روانہ کردیا۔ بعد میں وہ بھٹنڈا کا امیر مقرر ہوا، کچھ عرصے بعد سلطان قطب الدین ایبک کی تاج الدین یلدوز کے مابین ہونے والی جنگ میں مارا گیا۔

شمس الدین کو، سلطان قطب الدین ایبک نے، التمش کے لقب سے نوازا اور وہ اسے روز اوّل سے بے حد پسند کرتا تھا۔ وہ اس کی صورت اور حسن سیرت سے بے حد متاثر تھا۔ سو اس نے مثل اولاد، اس کی مزید تعلیم وتربیت پر توجہ دی، جس سے التمش کی خداداد ذہانت اور قابلیت کے جوہر مزید نمایاں ہوئے۔

قطب الدین ایبک شہاب الدین محمد غوری کا ایک ترک غلام تھا۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری کا کوئی بیٹا نہ تھا لہٰذا اُسے غلام رکھنے اور ان کی بہترین تعلیم وتربیت کا بے حد شوق تھا۔ اُسے اپنے سارے غلام بیٹوں کی طرح عزیز تھے۔ قصہ مشہور ہے کہ ایک بار کسی درباری نے سلطان کی اولادِ نرینہ سے محرومی کا ذکر کیا تو سلطان نے فخریہ جواب دیا کہ اکثر بادشاہوں کے ایک یا دو بیٹے ہوتے ہیں، مگر قدرت نے ترک غلاموں کی صورت میں مجھے ہزاروں بیٹوں سے نوازا ہے جو میری موت کے بعد میرے نام کو زندہ رکھیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد قطب الدین ایبک، تاج الدین یلدوز، ناصر الدین قباچہ اور محمد بن بختیار خلجی سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔

سلطان شہاب الدین محمد غوری قطب الدین ایبک سے بے حد انسیت رکھتا تھا۔ پہلے اس نے اسے شاہی اصطبل کا داروغہ مقرر کیا۔ کچھ عرصے بعد اسے خراسان کے فرمانروا کے خلاف ایک مہم کے لئے روانہ کیا۔ اس مہم میں اس نے انتہائی شجاعت اور بہادری کا ثبوت دیا اور میدان جنگ میں شاہ خراسان کو ازحد نقصان پہنچایا۔ لیکن بدنصیبی سے ایک دن وہ فوج کے ایک دستے کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ شاہ خراسان نے موقع پاکر اسے گرفتار کرکے ایک پنجرے میں قید کردیا اور حکم دیا ''جب تک یہ ہماری وفاداری کا حلف نہ اٹھائے اسے بند رکھا جائے اور حیوانوں کی طرح ہی غذا دی جائے۔''

اس واقعہ کے بعد محمد غوری خود لشکرِ جرار لے کر میدان جنگ میں آ نکلا اور شاہ خراسان کو زبردست شکست دی۔ ایبک کو پنجرے سمیت سلطان محمد غوری کے سامنے پیش کیا گیا۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری، قطب الدین ایبک کی شجاعت اور وفاداری سے بے حد متاثر ہوا، اور اس پر خصوصی توجہ دینے لگا۔ یہاں تک کہ دہلی اور اجمیر کی فتح یابی کے بعد اسے مفتوحہ علاقوں کا نائب السلطنت (گورنر) مقرر کیا۔

سلطان قطب الدین ایبک کی بھی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی، اس کی تین بیٹیاں تھیں، سو بیٹے کی کمی پوری کرنے کی خاطر اس نے آرام شاہ نامی ایک غلام زادے کو اس کی نوعمری کے دور سے ہی اپنا متبنیٰ کرلیا تھا۔ وہ آرام شاہ کو اپنی اولاد کی طرح ہی عزیز رکھتا تھا، اس نے اس کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی تھی، مگر اس معاملے میں وہ ناقص ثابت ہوا تھا۔ بے تحاشہ محبت وچاہت نے سنوارنے کی بجائے اس میں بگاڑ پیدا کردیا تھا، وہ ایک غصیلے، ترش مزاج اور بدفطرت انسان بن گیا تھا۔

ایبک کی تینوں بیٹیاں، کشمالہ، آمنہ اور ماہ نور بانو، آرام شاہ کو مثل بڑے بھائی کے تصور کرتی تھیں، مگر اسکا رویہ بہنوں کے ساتھ بھی کچھ زیادہ اچھا نہ تھا، اس کے بدطینت مصاحبوں نے اس کے ہوش سنبھالتے ہی سلطان بننے کے خواب دکھانے شروع کردیئے تھے، سو اپنے منہ بولے باپ سلطان قطب الدین ایبک کو نووارد غلام شمس الدین التمش پر مہربان ہوتے دیکھ کر اسکا ماتھا ٹھنکنے لگا تھا اور بلاوجہ ہی ہر بات پر وہ التمش کی مخالفت پر کمربستہ رہنے لگا۔

ایبک نے پہلے التمش کو میر شکار کے منصب پر فائز کیا اس کے بعد اُسے گوالیار کا حاکم مقرر کردیا۔

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے، التمش تمہیں سلطان کے دربار میں حاضر ہو کر انکا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔'' بادشاہ کے مشیر خاص امیر علی اسماعیل نے التمش کو مشورہ دیا۔ بوڑھا امیر جانتا تھا کہ سلطان ایبک، التمش کو کس قدر عزیز رکھتا ہے، اس کے اس طرح خدمت میں حاضر ہونے سے سلطان کو کس قدر خوشی ہوگی۔ سو سلطان کی خوشی کی خاطر التمش نے سلطان کے قصر میں حاضر ہو کر شکریہ ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔

دربان نے بصد احترام اس کی اندر کی جانب رہنمائی کردی تھی۔ اندرونی دروازے پر ایستادہ خادم اسے لے کر نشست گاہ کی طرف چلا۔ ابھی وہ ایک طویل غلام گردش سے گذر ہی رہے تھے کہ ایک نسوانی آواز پر خادم معذرت کرتا ہوا راہداری میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ التمش بیچ راہداری میں ہراساں کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ سنسان راہداری میں ادھر ادھر نگاہ دوڑا رہا تھا کہ کوئی خادم یا خادمہ دکھائی دے تو وہ اس سے دربار تک رہنمائی کی استدعا کرے۔

تب ہی ایک لڑکی تیزی سے دوڑتی ہوئی راہداری میں داخل ہوئی تھی اور اسے یوں بیچ راہ میں کھڑے دیکھ کر اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گئی۔

پائل کی مدھر جھنکار سن کر التمش نے اپنا چہرہ دوسری طرف گھما لیا تھا۔ اس کی نیچی نگاہ، بے ساختگی میں بھی اوپر نہیں اٹھی تھی۔ آنے والی لڑکی اس کی اس ادا پر حیران رہ گئی تھی۔ ایک جواں و رعنا مرد، اور شرم وحیا کا یہ عالم کہ بھولے سے بھی نگاہ کسی صفت مخالف کی طرف نہ اٹھے۔

''آپ کون ہیں؟ اور یہاں، اس طرح کیوں کھڑے ہیں؟'' لڑکی نے مترنم آواز اور تحکمانہ لہجے میں سوال کیا۔

''میرا نام شمس الدین التمش ہے...... اور میں امیر علی اسماعیل کے حکم پر سلطان معظم کی خدمت میں شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا تھا۔ خادم مجھے سلطان کی نشست گاہ کی سمت لے کر جا رہا تھا کہ کسی جانب سے آئی آواز سن کر وہ مجھے یہاں چھوڑ کر چلا گیا......''

التمش کے تفصیلی جواب پر لڑکی کے نازک کلیوں سے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ ایبک کی چھوٹی بیٹی ماہ نور تھی۔ باپ کی زبانی وہ روز ہی التمش کا تذکرہ اور تعریف سنتی رہتی تھی۔ آج اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اُسے بیان سے کہیں زیادہ پایا...... وہ التمش کی نیچی نگاہوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یک ٹک اس کی جانب تکے جا رہی تھی۔ اس کی روشن پیشانی، دمکتا کتابی چہرہ اور دلکش باوقار سراپا نگاہوں کی راہ سے اس کے دل میں کھبتا جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے التمش جز بز ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس نے تیزی سے واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے۔

صفحہ نمبر:......2

وہ چلا گیا تھا مگر جاتے جاتے اپنے ساتھ ماہ نور کے دل کا قرار بھی لے گیا تھا۔ بے کلی و اضطراب کے اس بوجھ کو وہ اکیلے نہ سہہ پا رہی تھی، سو اس نے اپنی بڑی بہن کشمالہ کو اس راز میں شامل کر لیا۔

''کیا کہہ رہی ہو ماہ نور؟'' کشمالہ نے ساری بات سن کر حیران اور ہراساں لہجے میں کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ، کیا کہہ رہی ہو؟''

''اس جذبے کو کیا کہتے ہیں، مجھے واضح طور پر تو معلوم نہیں۔'' ماہ نور نے معصومیت سے پلکیں جھپکتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن شاید اس جذبے کو عشق کہتے ہیں...... اگر یہ بے قراری اور بے کلی عشق ہے تو پھر مجھے...... التمش سے عشق ہو گیا ہے۔''

''یا اللہ۔'' کشمالہ نے بے ساختہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ کر خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو...... جو ایسی باتیں کر رہی ہو...... جانتی ہو اگر بھائی جان آرام شاہ کو اس بات کی بھنک بھی مل گئی تو وہ قیامت اٹھا دیں گے......''

''محبت کرنا، کسی کو چاہنا، کوئی گناہ تو نہیں ہے آپا؟'' ماہ نور نے رنجور لہجے میں پوچھا۔ ''پھر بھلا بھائی جان آرام شاہ کیوں قیامت اٹھائیں گے؟''

''ماہ نور...... میری بہن تم ابھی چھوٹی ہو...... تمہیں زمانے کے دستور اور رسم و رواج کا کچھ علم نہیں ہے۔'' کشمالہ نے بہن کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں تو بس اتنا جانتی ہوں آپا۔'' ماہ نور نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''کہ میں التمش سے محبت کرتی ہوں......'' ''یہ محبت فیصلہ ہے اک نظر کا، سو پہلی نظر میں وہ نگاہوں کی راہ سے میرے دل میں اتر گیا ہے، روح میں سما گیا ہے...... اب میں اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی......''

''ماہ نور۔'' کشمالہ نے اُسے شانوں سے تھام کر اپنے سامنے کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''خود کو سنبھالو میری بہن...... تمہاری محبت یک طرفہ ہے۔ تمہارا کہنا ہے کہ اس نے تمہیں نگاہ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں...... اور تم جانتی ہو، یہ یک طرفہ محبت ہمیشہ ہی بدنامی اور بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے......''

ماہ نور خاموش ہو گئی تھی۔

یہ سچ تھا کہ التمش نے اس کی جانب نگاہ تک نہ کی...... تو بھلا وہ کس طرح جان سکتی تھی کہ آخر اس کے دل میں کیا ہے؟

☆......☆......☆

قطب الدین ایبک نے گوالیار کے بعد، شمس الدین التمش کو برن (بلند شہر) کا حاکم اور اس کے بعد بدایوں کا ناظم مقرر کر دیا تھا۔

دہلی سے دور ہوئے اسے دو برس بیت گئے تھے۔ ان دو برسوں میں وہ ایک بار بھی دہلی نہیں آیا تھا۔ پہلی نگاہ میں اس پر فریفتہ ہو جانے والی وہ نظریں اسے دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔ پنجرے میں مقید پنچھی کی طرح اس کی روح قفس عنصری میں پھڑپھڑاتی رہتی اور مضطرب دل کی بے کل دھڑکنیں لمحہ لمحہ اس بے خبر کا نام لئے جاتیں۔

اس کی بڑی بہن کشمالہ اس کے غم میں برابر کی شریک تھی مگر وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

ان دنوں قطب الدین ایبک بھی گوناگوں پریشانیوں کا شکار تھا۔ افغانستان اور سندھ کے درمیانی علاقے کے حاکم تاج الدین یلدوز اور سندھ کے حاکم ناصر الدین قباچہ نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ سردار علی مردان، بنگال اور بہار میں بغاوت پر آمادہ تھا۔

سب سے پہلے تاج الدین یلدوز نے علم بغاوت بلند کیا۔ وہ صوبۂ پنجاب کو غزنی کی سلطنت میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس قطب الدین ایبک نے پنجاب کو سلطنت دہلی کا صوبہ ہونے کی حیثیت سے اپنے قبضے میں رکھنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔

تاج الدین یلدوز نے لاہور فتح کر لیا۔ لیکن اس کی یہ کامیابی دیرپا ثابت نہ ہوئی، کیونکہ قطب الدین ایبک نے جلد ہی اسے پنجاب سے نکال باہر کیا تھا۔ پھر غزنی پر حملہ کر کے تاج الدین کو وہاں سے بھی بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر تاج الدین 40 دن کے بعد تازہ دم فوج لے کر غزنی پر حملہ آور ہوا اور سلطان ایبک کو غزنی سے واپس لوٹنا پڑا۔

ایبک نے اب، دہلی کی بجائے لاہور کو اپنا دار السلطنت مقرر کیا۔ یلدوز کی دشمنی کے علاوہ قطب الدین کو ناصر الدین قباچہ اور علی مردان کی طرف سے بھی خدشہ تھا، لہٰذا وہ انہی خدشات میں گھرا حالات سے نپٹنے کی تدابیر سوچ رہا تھا۔ اس وقت امیر علی اسماعیل اور امیر داؤد دیلمی بھی اس کے ساتھ موجود تھے۔

لاہور کے گلی کوچوں میں سرمئی شام دبے پاؤں اتر رہی تھی۔ دوپہر کی جھلسا دینے والی گرمی شام کے نرم جھونکوں میں کہیں گم ہو چکی تھی۔ ایبک اپنی جگہ سے اٹھ کر دریچے میں آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی میں تفکر کی لکیریں ابھری ہوئی تھیں جبکہ آنکھوں سے پریشانی ہویدا تھی۔

''آپ کچھ متفکر دکھائی دے رہے ہیں؟'' بوڑھے امیر علی اسماعیل نے چند لمحوں تک اس کی جانب سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد سوال کیا۔

''تاج الدین یلدوز اور ناصر الدین قباچہ کی طرف سے خاصا فکر مند ہوں۔'' قطب الدین ایبک نے بغیر پس و پیش کے فکر کی اصل وجہ کی نشان دہی کر دی۔

''تاج الدین یلدوز کے خطرے کے پیش نظر دہلی کی بجائے لاہور کو دار السلطنت بنانا پڑا، اس کے باوجود حالات اختیار سے باہر دکھائی دے رہے ہیں۔''

''جنگ و جدل کر کے دیکھ لیا...... پر نتیجہ حسب منشا حاصل نہ ہو سکا۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد علی اسماعیل نے سنجیدہ لہجے میں بات کا آغاز کیا۔ ''اب میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے گوش گزار کروں۔''

''ہاں، ہاں ضرور۔'' ایبک نے پرزور انداز میں سر ہلایا۔

امیر علی اسماعیل ایبک کے کچھ اور قریب کھسک آیا۔ اشارے سے اس نے داؤد دیلمی کو بھی قریب کر لیا۔ پھر وہ تینوں سر جوڑ کر دیر تک اس تجویز کے ممکنہ اور غیر ممکنہ نکات پر غور کرتے رہے تھے۔

اور اگلے ہی دن سے ایبک نے اس تجویز پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

ایک اعلیٰ سطح کا شاہی وفد اعلیٰ درجے کے بیش قیمت تحائف کے ساتھ تاج الدین یلدوز کے دربار میں حاضر ہوا۔ سلطان قطب الدین ایبک نے خیر سگالی کے جذبے کے طور پر یلدوز کی خدمت میں بیش بہا تحائف بھجوائے تھے۔ ساتھ ہی دائمی دشمنی کا خاتمہ کرنے، دوستی اور خیر سگالی کے جذبات کو فروغ دینے کی خاطر اس نے یلدوز سے رشتے داری کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

تاج الدین یلدوز دیر تک اس کے پیغام پر غور کرتا رہا۔ سلطان دہلی نے اس سے رشتے داری کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ یہ اس کے لئے ایک اعزاز اور فخر و انبساط کی بات تھی۔ سو اس نے یہ رشتہ قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اور چند ہی دنوں بعد وہ یلدوز جو تیر و تفنگ اور لاؤ لشکر لے کر سلطنت دہلی پر حملہ کرنے لئے جایا کرتا تھا۔ آج وہ اپنی بیٹی قتلغ خانم اور قریبی رشتے داروں کے ساتھ لاہور کی طرف محو سفر تھا۔ بیش قیمت جہیز کے ساتھ اس نے اپنی منجھلی بیٹی کا عقد قطب الدین ایبک سے کر دیا تھا۔

ایبک نے اپنے سابقہ دشمن اور اس نئے رشتے دار کا بے حد محبت و احترام سے استقبال کیا اور تمام پرانی رنجشیں بھلا کر وہ دونوں گلے مل گئے۔ یلدوز پورے ایک مہینے تک سلطان کے قصر میں مہمان رہا۔ پھر سلطان نے اسے تحفے و تحائف سے لاد کر نہایت محبت سے رخصت کر دیا۔

تاج الدین یلدوز سے رشتے داری قائم ہو جانے کے بعد اب اس نے ناصر الدین قباچہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اپنی بڑی بیٹی کشمالہ سے اس کے عقد کا ارادہ ظاہر کیا۔

ناصر الدین قباچہ یہ پیغام پا کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ وہ قطب الدین ایبک جو اس کے لہو کا پیاسا تھا، اس کے ہاتھ میں اپنی چہیتی بیٹی کا ہاتھ دینے کا خواہش مند تھا۔ یہ پیغام قباچہ کے لئے حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ مسرت خیز بھی تھا۔ سو اس نے ایبک کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ وہ بہت جلد بارات لے کر آئے گا اور ایبک کی نور نظر کو اپنے گھر کی روشنی بنا کر لے جائے گا۔

یہ خبر سب سے پہلے ماہ نور کے پاس پہنچی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی کشمالہ کے پاس گئی تھی۔ ''آپا سنتی ہو...... کچھ خبر بھی ہے...... دنیا میں کیا ہونے والا ہے؟'' کشمالہ اس وقت اپنی پالتو مینا کے پنجرے میں دانہ اور پانی رکھ رہی تھی۔ چھوٹی بہن کی بات سنکر مسکرا کر بولی۔ ''مجھے دنیا کی کیا خبر...... میری دنیا تو مینا کے اس پنجرے تک ہی محدود ہے......''

''اب تمہاری دنیا سندھ تک لامحدود ہونے والی ہے۔'' ماہ نور شریر انداز میں مسکرائی۔ ''کیونکہ تمہارا عقد، سندھ کے حاکم ناصر الدین قباچہ سے ہونے والا ہے......''

''کیا کہہ رہی ہو؟'' کشمالہ نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

''سچ کہہ رہی ہوں۔'' ماہ نور شوخ انداز میں مسکرائی۔ ''بہت جلد ناصر الدین قباچہ تمہاری بارات لے کر آنے والے ہیں۔''

اور جلد ہی وہ مبارک گھڑی آ گئی۔ یہ شادی ماہ نور کیلئے اس لحاظ سے بھی مبارک تھی کہ اس شادی میں شرکت کرنے شمس الدین التمش خاص طور پر آیا تھا۔ ماہ نور نے ایک خادمہ کی مدد سے پردے کے پیچھے چھپ کر اپنے محبوب کا دیدار کیا تھا۔ ان دو برسوں میں، وہ کچھ اور باوقار اور کچھ اور شاندار ہو گیا تھا۔ ماہ نور کے بے تاب دل کی بے کلی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

اسی شام اسے پتہ چلا تھا کہ شمس الدین التمش بزرگ صوفی خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملاقات کے لئے اُن کے آستانے پر جانے والا ہے۔ التمش، بختیار کاکیؒ سے خاص انسیت و عقیدت رکھتا تھا اور جب بھی یہاں آنا ہوتا تھا تو ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا تھا۔

ماہ نور کی رازدار کشمالہ بیاہ کر پیا کے دیس سدھار گئی تھی۔ سو اب اس نے اپنے باپ کی نئی نویلی دلہن قتلغ خانم بنت تاج الدین یلدوز کو اپنے راز میں شامل کرنے کے لئے منتخب کیا۔

''کیا کہتی ہو ماہ نور؟'' وہ حیران ہوئی۔ ''کیا واقعی یہ سچ ہے؟''

''جی یہ بالکل سچ ہے۔'' ماہ نور نے نگاہیں جھکا کر اعتراف محبت کیا۔

''کیا وہ بھی تم سے اسی قدر محبت کرتے ہیں؟'' قتلغ خانم نے پر اشتیاق لہجے میں سوال کیا۔

''انہیں تو میری محبت کا علم ہی نہیں۔'' ماہ نور نے آہ بھر کر کہا۔ ''اسی لئے تو آج میں حضرت بختیار شاہ کاکیؒ کے آستانے پر جانا چاہتی ہوں، کہ شاید وہاں ملاقات اور عرض حال کا موقع مل جائے...... کیا آپ کسی طرح میرے ساتھ وہاں چل سکتی ہیں؟''

''میں اپنی سی پوری کوشش کروں گی۔'' قتلغ خانم مسکرائی۔ ''تاکہ آج میں بھی تمہارے انتخاب کا دیدار کر سکوں۔''

☆......☆......☆

قتلغ خانم شمس الدین التمش کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی تھی، وہ مردانہ وجاہت کا ایک شاندار پیکر تھا۔ اس وقت وہ حضرت بختیار کاکیؒ کے سامنے آنکھیں بند کئے محبت و عقیدت سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اپنے چہرے پر نظروں کی تپش محسوس کر کے بے ساختہ اس نے آنکھیں کھول کے سامنے کی طرف دیکھا۔ سامنے نیم وا دریچے میں دو تشنہ نگاہیں سراپا اشتیاق بنی اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ماہ نور بے خودی یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی...... التمش نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ ان پرشوق نظروں میں جانے کیا تھا کہ اُسے اپنے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔

تب ہی ایک خادم نے آ کر اطلاع دی تھی کہ قطب الدین ایبک کی بیگم اور صاحبزادی بختیار کاکیؒ سے ملاقات کی خواہش مند ہیں۔ بختیار کاکیؒ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ التمش کو حجرے میں ہی چھوڑ کر وہ نگاہیں جھکائے باہر نکل آئے۔

قتلغ خانم اور ماہ نور بانو نے چہروں پر نقاب گرا لئے تھے۔ دونوں خواتین نے جھک کر عزت و عقیدت سے ان کی خدمت میں سلام پیش کیا۔

''میں آپ سے دعا کی درخواست کرنے آئی ہوں۔'' ماہ نور نے دھیمی آواز میں التماس کی۔

''میری بچی! تم پریشان نہ ہو۔'' بختیار کاکیؒ نے اس کی طرف شفقت بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم جمع خاطر رکھو تمہاری دلی تمنا انشاء اللہ جلد پوری ہو گی......''

''کک...... کیا...... میں۔'' ماہ نور نے سٹ پٹائے ہوئے انداز میں تصدیق چاہی۔

''ہاں۔'' بختیار کاکیؒ نے درمیان میں ہی اس کی بات کاٹ دی۔ ''لیکن خیال رہے وہ ایک نیک طینت اور اوصاف طاہرہ کا مالک انسان ہے۔ جلد بازی میں کوئی ناشائستہ بات کر کے خود کو اس کی نگاہ سے نہ گرا لینا......''

''میں محتاط رہوں گی جناب عالی۔'' ماہ نور نے جلدی سے جواب دیا۔ واپسی میں وہ بے حد مسرور دکھائی دے رہی تھی۔ صوفی بزرگ نے اس کے خواب کو شرمندہ تعبیر ہونے کی نوید دے دی تھی، اب وہ مطمئن اور آسودہ تھی۔

☆......☆......☆

شمس الدین التمش جن دنوں بدایوں کا حاکم تھا انہی دنوں سلطان شہاب الدین محمد غوری آخری مرتبہ گکھڑوں اور بعض تاریخ دانوں کے مطابق کھوکھروں کا فساد رفع کرنے پنجاب آیا۔ قطب الدین ایبک گکھڑوں کے خلاف، سلطان کی مہم میں شرکت کرنے کے لئے دہلی سے اُسکی خدمت میں حاضر ہوا تو شمس الدین التمش بھی اس کے ہمراہ اس مہم میں شامل تھا۔

پنجاب کا نیلا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ صبح کاذب کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی، جس کے باعث میدان جنگ سے ملحقہ جھیل میں پانی کی سطح کچھ اور بلند محسوس ہو رہی تھی۔ بارش سے سارے شجر و حجر دھل دھلا کر نکھر گئے تھے۔ ہوا کے نرم اور سبک جھونکوں میں ہلکی سی نمی کے ساتھ دور تک پھیلی ہریالی کی سوندھی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

میدان کی پچھلی جانب ہزاروں کی تعداد میں گکھڑ صف آرا تھے۔

دوپہر کے بعد معرکہ شروع ہوا۔ التمش اپنے گھوڑے پر سوار اپنے دستے کے ساتھ میدان میں اترا۔ اس لڑائی میں اس نے گکھڑوں کے خلاف لڑتے ہوئے بہادری اور شجاعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ سلطان شہاب الدین غوری متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

التمش تلوار لہراتا ہوا جس طرف نکلتا، کشتوں کے پشتے لگا دیتا۔ وہ گکھڑوں کو دھکیلتا ہوا جھیل کی پچھلی جانب تک لے گیا۔ پھر اس نے اپنا گھوڑا جھیل میں اتار دیا تھا اور اس جوانمردی اور بہادری سے لڑا کہ گکھڑوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ صرف اس ایک معرکے میں التمش نے 12 ہزار گکھڑوں کو تہہ تیغ کیا۔

شہاب الدین محمد غوری التمش کے اس شجاعت اور کارنامہ سے بے حد خوش ہوا۔

اگلے دن دربار میں اس نے خاص طور پر التمش کو بلوایا۔ قطب الدین ایبک بھی اپنے اس ہونہار اور شاندار غلام کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا۔

سلطان نے کھڑے ہو کر التمش کا استقبال کیا اور بصد محبت و احترام اُسے اپنے پہلو میں جگہ دی اور خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا۔

''مجھے یاد ہے۔'' شہاب الدین محمد غوری، التمش کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکے تبسم کے ساتھ گویا ہوا۔ ''جب حاجی جمال تمہیں غزنی میں میرے پاس لایا تھا تو اس نے کہا تھا۔ ''میں ایک نایاب ہیرا لایا ہوں۔'' اور کل کے معرکے میں تم نے یہ ثابت کر دیا کہ واقعی تم ایک دُرِ نایاب اور لعل بے بدل ہو۔''

التمش کے دلکش چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی اور فرط مسرت سے اسکا چاند سا چہرہ دمک رہا تھا۔ تقدیر کی اس مہربانی اور سلطان کی اس عزت افزائی کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

''ایبک'' سلطان شہاب الدین محمد غوری، قطب الدین ایبک سے مخاطب ہوا۔ ''اب وقت آ گیا ہے...... تو اسے طوق غلامی سے آزاد کر دے...... اور اسے اس کی اہلیت اور لیاقت کے مطابق مرتبے اور مقام سے نوازا جائے۔''

''جو حکم سلطان معظم۔'' قطب الدین ایبک نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے جواب دیا اور اسی وقت ایک تحریری حکم نامہ کے ذریعے شمس الدین التمش کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا اور امیر الامراء کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

☆......☆......☆

آسمان کی نیلگوں جھیل میں چاند کا سنہرا کنول ہچکولے لے رہا تھا۔ ہر سو تسکین آمیز ٹھنڈی اور میٹھی چاندنی بکھری ہوئی تھی۔

التمش اس وقت اپنی حویلی کے پائیں باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ دور تک بچھے سبزے کے مخملیں فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پرکیف ہوا کے جھونکوں میں نوخیز و دل آویز پھولوں کی مہکار رچی ہوئی تھی۔ اس سحر آگیں ماحول میں التمش آہستہ روی سے ٹہل رہا تھا اور اپنے کمرے کے دریچے میں کھڑی شاہ ترخان اُسے خوابناک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

شاہ ترخان ایک ترک نژاد کنیز تھی۔ فطرتاً وہ جاہ پسند اور عیش و آرام کی دلدادہ تھی۔ ہندوستان میں غلاموں اور کنیزوں کی قدر افزائی کے قصے سن سن کر ایک آسودہ اور عیش و عشرت کی زندگی کی آرزو لئے وہ ہندوستان آئی تھی اور ایک روز سر راہ التمش پر نگاہ پڑتے ہی وہ دل و جان سے اُس پر فدا ہو گئی تھی۔ التمش گھوڑا دوڑاتا دور نکل گیا تو اس نے قریب سے گزرتے ایک سرکاری کارندے سے خوبرو نوجوان کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

''وہ، شمس الدین التمش تھے...... شہر بدایوں کے ناظم ہیں اور وہ سامنے والی اونچی برجوں والی حویلی انہی کی ہے......''

سپاہی کے مفصل جواب نے شاہ ترخان کے سینے میں جاگتی شوق کی آگ کو اور بھڑکا دیا تھا اور وہ آہستگی سے اس کی حویلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ ایک چالاک، عیار اور فتنہ گر عورت تھی، حویلی کے بوڑھے منتظم زوار خان کو بے وقوف بنانا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ سو وہ شام کو ہی اس حویلی میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ لمبے قد کی ایک بے حد حسین دوشیزہ تھی۔ اس کی بڑی بڑی گنجی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی، اور اس کے گلابی رخسار قندھار کے اناروں کی یاد دلاتے تھے۔ اس کے تراشیدہ شنگرفی لب کلیوں کی طرح نرم اور دلکش تھے۔ اس کے گھنے سنہری بال بے حد نرم اور چمک دار تھے۔ اسے اپنے حسن پر بڑا ناز تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ اپنے ان ''ہتھیاروں'' کے ذریعے کسی کو بھی اپنا دیوانہ بنا سکتی ہے۔

مگر اُسے اس وقت حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب وہ سولہ سنگار کئے ناز و انداز سے کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی اور التمش اس کی جانب دیکھے بنا نگاہیں جھکائے نکلا چلا گیا تھا۔ اس کی شان بے نیازی نے اس کی تڑپ میں اور اضافہ کر دیا۔ آدھی رات کے بعد شب خوابی کا لباس زیب تن کر کے اور خود کو مسحور کن خوشبوؤں میں بسا کر وہ التمش کی خواب گاہ کی طرف چل دی تھی۔ اس وقت وہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی اپسرا لگ رہی تھی اور اسے پورا یقین تھا کہ اس پل وہ التمش کے پتھر دل کو پگھلانے میں کامیاب ہو جائیگی۔

مگر یہ کیا؟

وہ جوں ہی دروازہ دھکیل کر آہستگی سے خواب گاہ میں داخل ہوئی تو، اس نے دیکھا التمش کا بستر خالی تھا وہ کمرے میں موجود نہ تھا۔ وہ ادھر ادھر نگاہ دوڑاتی، دالان سے باہر نکل آئی، کیا دیکھتی ہے کہ سامنے چھوٹے صحن میں واقع کنوئیں سے التمش پانی نکال رہا تھا، خادم قریب ہی بستر لگائے سو رہا تھا۔ التمش نے خادم کو جگا کر پانی نکالنے کا حکم دینے کی بجائے خود ہی ڈول ڈال کر کنوئیں سے پانی نکالا تھا اور اب کنوئیں کے چبوترے پر بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ وضو کے بعد وہ دالان میں چلا آیا اور کونے میں جائے نماز بچھا کر تہجد کی نماز ادا کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

شاہ ترخان خاموشی سے واپس لوٹ آئی تھی، تمام رات وہ سو نہیں سکی تھی اور مسلسل التمش کو زیر کرنے کے نکتے پر غور کرتی رہی تھی، صبح دم اُسے فجر کی نماز کی ادائیگی کے لئے تیزی سے مسجد کی سمت جاتے ہوئے دیکھ کر وہ سوچ رہی تھی کہ اس مرد مومن کو ناز و ادا کے ہتھکنڈوں سے بہکایا نہیں جا سکتا، اسے حاصل کرنے کے لئے کچھ اور سوچنا پڑے گا...... اور اس وقت وہ اپنے کمرے کے دریچے میں کھڑی التمش کو خوابناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے، مسلسل اسی مسئلے پر غور کر رہی تھی۔

آخر کار اس کے ذہن رسا نے اسے ایک ترکیب سمجھا ہی دی۔

اور اگلی صبح قرینے سے دوپٹہ اوڑھے نگاہ نیچی کئے اور سر جھکائے وہ حویلی کے بوڑھے منتظم زوار خان کے پاس جا پہنچی تھی۔

''خان بابا! میں آپ سے ایک گزارش کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے نگاہ جھکائے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کہو بی بی۔'' بوڑھا زوار خان شفیق لہجے میں بولا۔ ''تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے نا؟ تم آرام سے تو ہو؟''

''بظاہر مجھے کوئی تکلیف نہیں۔'' شاہ ترخان نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''پر دلی طور پر میں انتہائی کرب میں مبتلا ہوں۔'' پھر اس نے نگاہ جھکا کر، راستے میں التمش کو دیکھنے کے بعد سے کل رات کو اس کی خواب گاہ میں جانے تک کی ہر بات بوڑھے منتظم کے گوش گزار کر دی۔

''اوہ'' ساری بات سن کر بوڑھے منتظم نے پر تشویش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم کیا چاہتی ہو......''

''میں چاہتی ہوں کہ آپ ان تک میرا ایک پیغام پہنچا دیں۔'' شاہ ترخان نے حسب سابق دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''پیغام؟'' بوڑھا زوار خان قدرے حیرت سے بولا۔ ''کہو کیا پیغام ہے؟''

''آپ ان سے جا کر کہیے کہ میں ایک غلام خاندان کی معمولی، حقیر اور بے قیمت کنیز بدایوں کے ناظم سے عقد کی آرزو رکھتی ہوں...... اگر انہوں نے میرے اس پیام کو ٹھکرا دیا۔ تو میں اسی کنوئیں میں کود کر جان دے دوں گی...... جس سے پانی نکال کر وہ...... تہجد کے لئے وضو کرتے ہیں......''

بوڑھے منتظم زوار خان نے شاہ ترخان کی کہی ہوئی ایک ایک بات بے کم و کاست، شمس الدین کے گوش گزار کر دی۔

التمش یہ باتیں سن کر کئی لمحوں تک ساکت و جامد رہ گیا۔ شاہ ترخان نے جس انداز سے اپنی محبت اور خواہش کا اظہار کیا تھا وہ انداز بڑا ہی دل پذیر تھا۔ التمش نے ایک لمحہ سوچے بغیر، زوار خان کی طرف دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

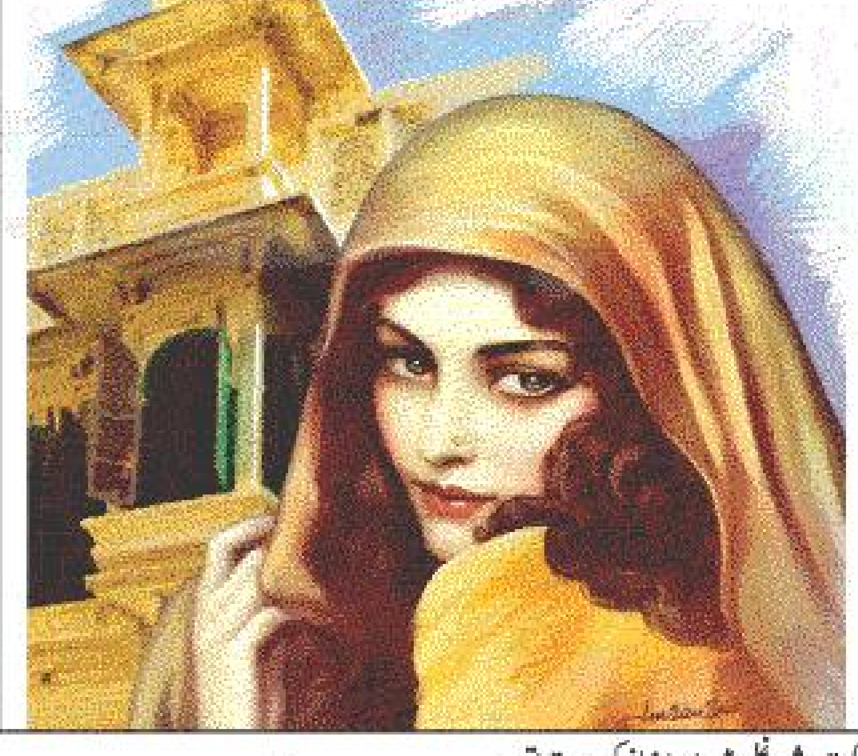
''زوار خان، وہ لڑکی جو کوئی بھی ہے اگر وہ مجھ سے نکاح کی خواہش مند ہے تو میں اس کی اس خواہش کا احترام کروں گا...... میں اس سے اسی وقت عقد مسنون کے لئے تیار ہوں...... آپ اسے خبر دے دیجئے اور عقد کا انتظام کیجئے۔''

اور پھر اسی شام، شمس الدین التمش نے ترک کنیز زادی شاہ ترخان سے عقد کر لیا۔ جبکہ دہلی کے قصر شاہی میں بیٹھی سلطان زادی ماہ نور بانو، آنکھوں میں انتظار کے دیپ جلائے دل میں امید کے پھول کھلائے تمام تر چاہتوں اور وفاؤں کے ساتھ، اس کی راہ دیکھتی رہ گئی۔

(جاری ہے)

دہلی کے کوچہ و بازار میں سیاہ رات نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

آسمان پر چھائے سیاہ اور گھنے بادلوں نے رات کی تاریکی میں کچھ اور اضافہ کر دیا تھا۔ ہوا کے تیز جھکڑوں میں ایک عجب سی درشتی اور خنکی رچی ہوئی تھی۔ وہ شوں شوں کے پرزور شور کے ساتھ گھنے پیڑوں سے گزرتے اور بند دریچوں سے ٹکراتے پھر رہے تھے۔ کبھی کبھی بادل



کڑک کر اس شور و غل میں اور اضافہ کر دیتے تھے۔

ناصر الدین قباچہ سے قطب الدین ایبک کی بڑی بیٹی کشمالہ کی شادی کو ڈیڑھ برس ہونے کو آئے تھے۔ بفضل تعالیٰ وہ ماں بننے والی تھی اور رواج کے مطابق اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے لئے وہ اپنے باپ کے گھر آئی ہوئی تھی۔

قصر ایبک کے اندرونی کمروں میں سے ایک کمرے میں وہ اس وقت تخلیق کے کربناک مرحلے سے گزر رہی تھی۔ اس کی دونوں بہنیں آمنہ اور ماہ نور بانو، اس کی نو وارد سوتیلی ماں قتلغ خانم اور ایبک کی دیگر بیگمات قریبی ایوان میں موجود تھیں اور اس کے بخیر و عافیت فارغ ہو جانے کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

کشمالہ کے کمرے میں ماہر اور مشاق دائیاں اور چند کنیزیں موجود تھیں۔ کل رات سے وہ کرب و اذیت کے اس سمندر میں غوطہ زن تھی۔ دائیاں اپنا سارا ہنر اور ہر داؤ آزما چکی تھیں اور ناکام رہی تھیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کشمالہ کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ احساس اذیت اس کی بے خواب آنکھوں میں منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا گلابی شاداب چہرہ سوکھے پتے کی طرح زرد پڑ چکا تھا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر بہ تر تھی اور ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑتے جا رہے تھے۔

مردانہ نشست گاہ میں قطب الدین ایبک کے ساتھ ناصر الدین قباچہ اور دیگر احباب و مصاحبین موجود تھے۔ سب کی نگاہیں نیم وا دروازے کی جانب اور کان اندرونی کمرے سے آتی کسی نومولود کی مبہم اور مترنم رونے کی آواز پر لگے تھے۔

ناصر الدین قباچہ کی آنکھوں میں امید کی قندیلیں روشن تھیں، جبکہ قطب الدین ایبک کے چہرے پر شوق و اشتیاق کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہ پہلی بار نانا بننے والا تھا۔ اس کی پہلی اولاد، صاحب اولاد ہونے والی تھی۔ گو کہ آرام شاہ بھی شادی شدہ تھا مگر وہ اب تک اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ اس لئے اس پہلی خوشی نے ایبک کو بے حد مسرور کیا ہوا تھا۔ اس کے کان مبارک سلامت کے جملے سننے کے لئے بے تاب تھے اور آنکھیں اپنے نواسے کا چاند سا مکھڑا دیکھنے کے لئے بے تاب تھیں۔

کشمالہ کی حالت مزید بگڑتی جا رہی تھی۔ بوڑھی دائیاں کبھی اس کی ساکت ہوتی ہوئی آنکھیں اور سپید پڑتے چہرے کی طرف دیکھتیں اور کبھی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتیں......

ایک دم کشمالہ کو اپنے وجود میں درد کی شدید لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔

"اف" شدت کرب سے اس نے اپنے خشک لب دانتوں تلے دبا لیے اور اپنے سرد ہاتھوں سے قریب کھڑی کنیز کا ہاتھ جکڑ لیا تھا۔ دونوں دائیاں اسے سنبھالنے اور اپنی سی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں۔

اچانک زور سے بادل گرجے اور کمرے کی ساکت فضا نومولود کے رونے کی مترنم آواز سے متحرک ہو گئی۔

ادھر بچے نے آنکھیں کھولی تھیں ادھر کشمالہ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

قطب الدین ایبک نواسے کی پیدائش پر شاداں تھا، پر جواں سال بیٹی کی موت نے اسے از حد سوگوار کر دیا تھا۔ کچھ یہی حال ناصر الدین قباچہ کا بھی تھا، چاند سے بیٹے کی ولادت پر وہ بے حد خوش تھا مگر نیک طینت، دین دار اور وفادار بیوی کی دائمی جدائی پر از حد رنجیدہ و کبیدہ خاطر تھا۔ ایک جانب محبت کرنے والی شریک حیات کی موت کا غم تھا تو دوسری جانب بن ماں کے بچے کی پرورش کی فکر تھی۔

آمنہ اور ماہ نور کا بھی رو رو کر برا حال تھا۔ خاص طور پر ماہ نور کو کشمالہ کی موت کا از حد دکھ تھا۔ وہ اس کی بڑی بہن ہی نہیں راز دار اور غم گسار سہیلی بھی تھی۔ قتلغ خانم کیونکہ ان دونوں کی تقریباً ہم عمر ہی تھی، اس لئے ایبک کی دیگر بیگمات کی نسبت وہ ان دونوں کے زیادہ قریب تھی۔ اس وقت وہ ان کے غم میں برابر کی شریک تھی۔

نومولود کو اس کی بڑی خالہ آمنہ نے اپنی آغوش محبت میں سمیٹ لیا۔ ماہ نور کو تو اپنا بھی ہوش نہ تھا وہ پچھاڑیں کھا کر گرتی اور بے ہوش ہو جاتی تھی۔

سوئم کے بعد ناصر الدین قباچہ نے رخت سفر باندھا۔ وہ اپنے ساتھ نومولود کو بھی لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

قطب الدین ایبک آخری بار نواسے کو دیکھنے آمنہ کے کمرے میں آیا۔ اس نے دیکھا، معصوم بچہ خالہ کی آغوش میں بے خبر سویا ہوا ہے۔ اسے خبر ہی نہ تھی کہ قدرت نے اس سے ماں جیسی نعمت چھین لی ہے۔ وہ خالہ کی گود کو بھی ماں کی آغوش سمجھ رہا تھا۔

"ناصر الدین، بچے کو ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" ایبک نے اطلاع دی۔

"اوہ!" آمنہ کی بے خواب آنکھوں سے تشویش جھلکنے لگی۔ "اتنے چھوٹے بچے کی پرورش کی وہاں کیا صورت ہو گی؟"

"یہ میں نے ان سے پوچھا نہیں۔" قطب الدین ایبک نے افسردہ نظروں سے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ......وہ اسے یہیں چھوڑ جائیں......میرے پاس۔" آمنہ نے دھیمی آواز میں اپنی سوچ کا اظہار کیا۔ "ان چند دنوں میں یہ مجھ سے خاصا مانوس ہو گیا ہے۔"

قطب الدین ایبک خاموش نگاہوں سے آمنہ کی طرف دیکھتا، اس کی بات پر غور کرتا رہا۔ پھر سر ہلاتا ہوا نشست گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ناصر الدین قباچہ جانے کے لئے بالکل تیار بیٹھا تھا۔

"اتنے چھوٹے بچے کی پرورش کے لئے آپ نے کیا سوچا ہے؟" ایبک نے داماد سے سوال کیا۔

"ابھی تو کچھ نہیں۔" قباچہ نے مایوس لہجے میں جواب دیا۔ "جو مالک کو منظور ہو۔"

"اس سلسلے میں، میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد ایبک نے پر سوچ لہجے میں کہا۔

"فرمایئے!" ناصر الدین قباچہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوا بولا۔

"بچے کی بہتر پرورش اور تربیت کی خاطر میں اپنی منجھلی بیٹی آمنہ کا عقد آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔" قطب الدین ایبک نے صاف اور واضح آواز میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"میں اسے اپنی خوش بختی تصور کروں گا۔" ناصر الدین قباچہ نے سر جھکاتے ہوئے ممنون لہجے میں جواب دیا۔ "اور آپ کے اس احسان اور شفقت کو تا حیات نہ بھول سکوں گا......"

اگلے دن عصر کے بعد آمنہ کا نکاح ناصر الدین قباچہ سے پڑھوا دیا گیا اور ہفتے بھر بعد ناصر الدین اپنی نئی نویلی دلہن آمنہ اور اپنے نوزائیدہ بچے فخر الدین کے ساتھ اپنے علاقے کے لئے روانہ ہو گیا۔

کشمالہ کی موت اور آمنہ کی شادی کے بعد ماہ نور بانو کے لئے قصر گویا کہ ایک دم خالی اور ویران ہو گیا تھا۔ وہ کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح قصر کے ایوانوں، دالانوں اور غلام گردشوں میں پھرا کرتی۔

"خود کو سنبھالو۔" ایسے میں قتلغ خانم کا دم غنیمت تھا۔ "اپنے لئے نہیں تو اس ہستی کے بارے میں سوچو، جسے تم دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہو۔"

"اسی کی وجہ سے تو زندہ ہوں۔" ماہ نور نے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "ورنہ شاید یہ تنہائی مجھے مار ہی ڈالتی......"

"جانتی ہو، نشست گاہ میں تمہارے بابا جان کے ساتھ کون موجود ہے؟" قتلغ خانم نے ماہ نور کے قریب جا کر شوخ انداز میں سرگوشی کی۔

ماہ نور نے زبان سے کچھ نہیں کہا، بس سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"بدایوں کے صوبیدار جناب امیر الامراء شمس الدین التمش۔" قتلغ خانم نے دونوں ہاتھ بلند کر کے فخریہ انداز میں التمش کا نام لیا تو ماہ نور چونک کر سیدھی ہو گئی۔

"آپ سچ کہہ رہی ہیں؟" اس کی مایوس آنکھوں میں روشنی سی جاگ اٹھی۔

"یقین نہ آئے تو راہ داری والے دریچے سے نشست گاہ میں جھانک کر دیکھ لو یقین آ جائے گا۔"

"اوہ!" ماہ نور ایک دم اٹھ بیٹھی اور تیزی سے باہر کی طرف چلی...... پھر چلتے چلتے رک کر بولی۔ "مگر اس طرح جھانکتے ہوئے مجھے کسی نے دیکھ لیا تو......؟"

"وہ راہ داری عموماً سنسان ہی پڑی رہتی ہے۔" قتلغ خانم نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "اس طرف سے دیکھے جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ تم اپنے ساتھ اپنی خادمہ رنجہ کو لیتی جاؤ......اسے راہ داری کے موڑ پر کھڑی کر دینا کہ کسی کو آتے دیکھ کر وہ تمہیں مطلع کر دے گی......"

ماہ نور کو کہیں بھی خادمہ رنجہ نظر نہیں آئی۔ مارے شوق کے وہ اکیلے ہی نشست گاہ کی طرف چل دی۔ راہ داری حسب معمول سنسان پڑی تھی۔ وہ پچھلے دریچے میں جا کھڑی ہوئی۔ نہایت احتیاط سے ذرا سا پردہ سرکا کر اندر جھانکا۔ سامنے ہی وہ دشمن جاں بیٹھا تھا۔ کمرے میں اس وقت اس کے اور ایبک کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ وہ حسب عادت نگاہیں نیچے کیے اور سر جھکائے تھا۔ اس کے باوقار اور وجیہ چہرے پر سنجیدگی اور افسردگی پھیلی ہوئی تھی۔

وہ یک ٹک اسے تکنے لگی، دل کی بے قرار دھڑکنوں کو کسی قدر سکون مل رہا تھا، محروم آنکھوں کی پیاس بجھ رہی تھی۔ تب ہی راہ داری میں قدموں کی چاپ ابھری تھی، مگر ماہ نور دیدار محبوب میں اس قدر محو تھی کہ اسے قدموں کی آہٹ سنائی ہی نہیں دی، جب کسی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا تب وہ ہڑبڑا کر پلٹی۔ سامنے اس کا بھائی آرام شاہ، آنکھوں میں حیرت لئے کھڑا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اس نے ترش لہجے میں پوچھا۔ پھر ذرا سا پردہ سرکا کر اندر جھانکا۔ سامنے التمش بیٹھا ہوا تھا۔ آرام شاہ کی آنکھوں میں غصہ اور تندی اتر آئی۔

"آئندہ کبھی میں نے تمہیں ایسی حرکت کرتے دیکھا، تو انجام کے بارے میں تم خود سوچ سکتی ہو۔" اس نے نفرت بھرے غصیلے لہجے میں کہا اور اسے شانے سے دھکیل کر اندر جانے کا اشارہ کیا اور خود پاؤں پٹختا نشست گاہ کی طرف چلا گیا۔

ماہ نور گھبرائی ہوئی اپنی خواب گاہ کی طرف بھاگی اور بستر پر گر کر رونے لگی۔

"ارے......ارے......کیا ہوا؟" قتلغ خانم اس کے پیچھے خواب گاہ میں داخل ہوئی تھی۔ "بھلا رونے کی کیا بات ہے؟"

ماہ نور نے ساری کہانی کہہ سنائی۔ "مجھے ڈر ہے کہیں بھائی جان، بابا جان سے نہ کہہ دیں...... پتہ نہیں پھر کیا ہو گا......"

"اوہ!" قتلغ خانم نے پرتشویش انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "خیر تم پریشان نہ ہو، میں دیکھتی ہوں...... میں سنبھال لوں گی......"

آرام شاہ نے قطب الدین ایبک سے تو کچھ نہیں کہا، پر اپنے تئیں ماہ نور کی شادی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے تھے۔ اس کی جستجو کی خبر، بنگال کے حاکم، شاہ علی مردان کو ہوئی تو اس نے ایک پیغام آرام شاہ کے نام روانہ کیا۔

"آپ کے والد گرامی حریفوں پر مہربان ہو رہے ہیں، تاج الدین یلدوز سے رشتے داری قائم کی، ناصر الدین قباچہ پر تو اس قدر شفقت فرمائی کہ دو بار اسے شرف فرزندی بخش دیا۔ اس بندہ ناچیز کی ایسی کیا خطا ہے کہ چشم عنایت سے اب تک محروم ہے...... کیا مجھ حقیر پر تقصیر کو شرف رشتے داری حاصل نہیں ہو سکتا؟"

آرام شاہ، علی مردان کا پیغام لے کر قطب الدین ایبک کے پاس پہنچا۔ ایبک اس کا پیغام پڑھ کر سوچ میں ڈوب گیا۔

"میرا خیال ہے اب ماہ نور بانو بڑی ہو چکی ہے۔" باپ کو خاموش پا کر آرام شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بہتر ہو گا کہ آپ اس کے عقد کے لئے سوچیں......"

قطب الدین ایبک بیٹے کی بات کا جواب دیے بغیر خاموشی سے اپنی خواب گاہ کی طرف چلا گیا۔ اس کے چہرے سے تفکر اور آنکھوں سے پریشانی ہویدا تھی۔

"آپ کچھ متفکر دکھائی دے رہے ہیں۔" قتلغ خانم نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے نرم اور ہمدرد لہجے میں سوال کیا تھا۔

"ہاں۔" ایبک نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "بنگال کے علی مردان کی طرف سے ایک پیغام آیا ہے...... ڈھکے چھپے لفظوں میں، اس نے، ماہ نور کے ساتھ عقد کا پیام بھیجا ہے......"

"اوہ!" قتلغ خانم کے لب پرتشویش انداز میں سکڑ گئے۔

"آرام شاہ کا خیال ہے کہ ماہ نور بڑی ہو چکی ہے......اب اس کا عقد ہو جانا چاہیے......" ایبک نے بات پوری کی۔ "پر میری نظر میں کوئی اور مناسب رشتہ نہیں ہے...... جبکہ علی مردان کو میں ماہ نور کے لحاظ سے مناسب نہیں سمجھتا۔"

"اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں۔" قتلغ خانم نے لحظہ بھر سوچنے کے بعد دھیمی مگر حوصلہ مند آواز میں کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" ایبک نے جواب دیا۔ "تمہارے دل میں جو بات ہے ضرور کہو۔"

"میری نظر میں ماہ نور کے لئے ایک بہترین رشتہ ہے......" قتلغ خانم نے دھڑکتے دل سے بات کا آغاز کیا۔ "اسے نا صرف آپ اچھی طرح جانتے ہیں بلکہ دل سے پسند بھی کرتے ہیں، اور اس سے از حد انسیت بھی رکھتے ہیں......"

"کہیں تمہارا اشارہ شمس الدین التمش کی طرف تو نہیں؟" ایبک نے چونک کر اپنی حسین اور نوجوان بیوی کی طرف دیکھا۔

"جی۔" قتلغ خانم نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہماری ماہ نور بانو جیسی نیک، اچھی اور خوب صورت بیٹی کے لئے شمس الدین التمش سے بہتر رشتہ اس روئے زمین پر موجود نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" قطب الدین نے چند لمحوں تک گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد جواب دیا۔

"میں شام کو حضرت بختیارؒ کے آستانے پر حاضری دینے جاؤں گا، ان سے مشاورت کے بعد التمش کو پیام بھجوا دوں گا۔"

"مجھے یقین ہے حضرت بختیار کاکیؒ بھی اس نسبت کو پسند فرمائیں گے۔" قتلغ خانم نے مسرت بھرے پرامید لہجے میں کہا۔

قطب الدین کے جاتے ہی وہ دوڑتی ہوئی ماہ نور بانو کی اقامت گاہ کی طرف چلی۔

"جانتی ہو میں اس وقت تمہارے لئے کیا خبر لے کر آئی ہوں؟" اس نے اداس اور خاموش ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے لئے وہ خوش خبری لے کر آئی ہوں کہ جسے سنتے ہی، تم خوشی سے ناچ اٹھو گی......"

"ایسی بھی کیا خوش خبری ہے؟" ماہ نور نے گہری سانس لے کر افسردہ لہجے میں پوچھا۔ اور قتلغ خانم نے اس کے کان میں اپنی اور ایبک کی ساری باتیں کہہ سنائیں۔

"کیا واقعی آپ سچ کہہ رہی ہیں؟" ماہ نور نے بے یقین نگاہوں سے اپنے باپ کی نوجوان اور حسین بیوی کی طرف دیکھا۔ "کیا بابا جان اس رشتے کے لئے آمادہ ہو گئے؟"

"بالکل۔" قتلغ خانم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اور وہ حضرت بختیار کاکیؒ کے آستانے پر گئے ہیں، ان کی رضامندی پاتے ہی وہ التمش کو پیغام بھجوا دیں گے......"

"اوہ میرے خدا۔" ماہ نور نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے قتلغ خانم کے ہاتھ تھام لئے۔ "بخدا مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا......کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ راہ گم کردہ مسافر یوں اچانک منزل مقصود پر پہنچ جائیں......"

"جذبہ صادق ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔" قتلغ خانم نے مسکرا کر جواب دیا۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی رضامندی پا کر ایبک نے التمش کو فوری طور پر حاضر ہونے کا پیغام بھجوا دیا تھا۔

سب ہی ایبک کے اس فیصلے پر خوش تھے مگر اس کے متعنی آرام شاہ کو یہ رشتہ پسند نہیں آیا تھا۔

"بابا جان، شاید آپ بھول رہے ہیں، وہ ایک غلام ہے......وہ ایک سلطان زادی کے لائق نہیں۔"

"صاحبزادے، شاید تمہیں یاد نہیں، قطب الدین ایبک نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا، وہ اب غلام نہیں، اسے سلطان محمد غزنوی نے امیر الامراء کے خطاب سے نوازا ہے......اور شاید تم بھول رہے ہو ......کہ تمہارا یہ بابا جان بھی کبھی غلام تھا......"

التمش کے حاضر ہونے کے بعد جب اس نے اس کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا، تو وہ لحہ بھر کو حیرت زدہ رہ گیا۔ ہندوستان کا سلطان قطب الدین ایبک، اپنی لخت جگر کو اس کی زوجیت میں دینا چاہ رہا تھا۔

"التمش نے حضرت بختیار کاکیؒ سے مشورے کے بعد سر تسلیم خم کر دیا۔

ماہ نور ایبک کی سب سے چھوٹی اور آخری اولاد تھی، سو اس کی شادی پر قطب الدین نے اپنے دل کے سارے ارمان نکالنے کا فیصلہ کیا۔ بے حد دھوم دھام کے ساتھ یہ شادی انجام پذیر ہوئی۔

حجلۂ عروسی میں ماہ نور بانو نے بیتے ہوئے لمحوں کی ایک ایک روداد اسے کہہ سنائی تھی۔

"اگر اس شام، قصر کی راہ داری میں آپ چند لمحے اور رکتے تو میں آپ کے سامنے دامن دل پھیلا کر آپ سے محبت کی بھیک مانگتی......"

"جانتی ہو، میرا جواب کیا ہوتا۔" التمش اس کے چاند چہرے پر اپنی ستارہ آنکھیں ٹکاتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولا۔ "میں کہتا، میں ایک حقیر غلام ہوں، میں ایک شاہ زادی کے قابل نہیں ہوں......"

"اگر خدانخواستہ یہ شادی نہ ہوتی تو، میں یہ سمجھتی کہ، میں حرماں نصیب آپ کے قابل نہ تھی۔"

رات جوں جوں بھیگتی جا رہی تھی، ان کے محبت کے دریا کی طغیانی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

چند ساعتوں کی نیند کے بعد التمش اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا؟" ماہ نور نے کسمسا کر نیند بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"کچھ نہیں تم سو جاؤ...... میں ذرا تہجد ادا کر لوں۔" التمش اٹھ کر دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے بولا۔

"خادم کو آواز دے لیجئے۔ وہ غسل کے لئے پانی کا انتظام کر دے گا۔" ماہ نور نے مشورہ دیا۔

"اتنی رات گئے، خادم کو گہری نیند سے جگا کر بے آرام کرنے کی کیا ضرورت ہے، میں کنویں سے خود ہی پانی نکال لوں گا۔" التمش نے جواب دیا اور باہر نکل گیا۔

رواج کے مطابق ہفتے بھر سسرال میں رہ کر وہ اپنی نئی نویلی دلہن ماہ نور کو ہمراہ لئے اپنے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

قطب الدین ایبک کے خصوصی پیغام پر ہی شاہ ترخان کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

"بھلا سلطان کو، آپ سے ایسا کیا کام آن پڑا کہ اس نے آپ کو فوری طور پر حاضر ہونے کے لئے کہا ہے۔" شاہ ترخان نے شک بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

"مجھے کچھ اندازہ نہیں۔" التمش نے تیار ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ تو وہاں جا کر ہی پتہ چلے گا......"

شاہ ترخان کے التمش سے عقد کو ایک سال سے اوپر ہو گیا تھا، مگر وہ اب تک اولاد کی نعمت سے محروم تھی، التمش جیسے شاندار اور وجیہ شوہر کی طرف سے وہ ہر وقت خدشات کا شکار رہتی تھی......اسے ہر لحہ یہ ڈر رہتا تھا کہ اس کی راج دھانی میں کوئی اور حصہ بٹانے کے لئے نہ آ دھمکے...... اور آج کے اس کے یہ خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ جب التمش اپنے ساتھ ماہ نور بانو کو لیے گھر پہنچا تھا۔

شاہ ترخان کے سینے پر سانپ لوٹ گیا تھا۔ پر وہ خاموش رہنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتی تھی، آنے والی کوئی معمولی لڑکی نہ تھی، وہ دہلی کے سلطان کی بیٹی ماہ نور بانو تھی، حسن صورت میں ہی نہیں حسن سیرت میں بھی یکتا و نادر تھی۔

ٹھیک نو ماہ بعد ماہ نور نے ایک چاند سے بیٹے کو جنم دیا۔ التمش اپنے پہلوٹھی کے بیٹے کی پیدائش پر بے حد خوش تھا۔ بہت چاؤ سے اس نے، بچے کا نام "ناصر الدین محمود" رکھا۔

ناصر الدین محمود اسے بے حد عزیز تھا، اس نے اس کی تعلیم و تربیت اور پرورش پر خصوصی توجہ دی تھی۔

ماہ نور کے ماں بن جانے پر شاہ ترخان کی حسد اور تڑپ میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ رات دن حصول اولاد کے لئے کوشاں تھی۔ وید، حکیم، ملا مولوی، جادو ٹونا سب کر کے دیکھ لیا تھا......شادی کو چار برس بیت گئے تھے......اس کی سوت ماہ نور، بیٹے ناصر الدین محمود کی پیدائش کے 10 ماہ بعد ایک حسین اور ذہین بیٹی، رضیہ کی ماں بن چکی تھی، جبکہ اس کا دامن امید اولاد سے اب تک خالی تھا۔

"آپ حضرت بختیار کاکیؒ سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔" ایک دن اس نے التمش سے کہا تھا۔ "اگر آپ اجازت دیں، اور حضرت کو اعتراض نہ ہو تو میں بھی ان کے آستانے پر حاضری دے کر دعا کی درخواست کرنا چاہتی ہوں۔"

میں تمہاری خواہش ان تک پہنچا دوں گا۔" التمش نے جواب دیا۔

☆......☆......☆

"اس سے کہو، یہاں آ کر حاضری دینے کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔" حضرت بختیارؒ نے التمش کی زبانی شاہ ترخان کا پیغام سن کر دھیمے مگر قدرے سرد لہجے میں جواب دیا۔ "میں اس کے لئے دعا گو ہوں، جو وہ چاہتی ہے پاک پروردگار اس کی آرزو پوری کرے پر کچھ اس طرح، کہ آنے والا......سلطنت کے لئے مصیبت اور عذاب کا باعث نہ ہو۔"

صفحہ نمبر:......2

شمس الدین التتمش اپنے پیرومرشد کی بات کا مفہوم نہ سمجھ سکا تھا۔ بس خاموشی سے سرہلا کر رہ گیا تھا۔

اور رضیہ کی پیدائش کے ٹھیک 13 ماہ بعد شاہ ترخان نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔

اپنے دوسرے بیٹے، رکن الدین فیروز کی ولادت پر شمس الدین التتمش حسب سابق مسرور تھا، مگر شاہ ترخان کی خوشی دیدنی تھی۔ آخر اس نے ناصر الدین محمود کے مقابلے کے لئے، ایک بیٹے کو جنم دے ہی دیا تھا۔

☆......☆......☆

سلطان شہاب الدین محمد غوری نے قطب الدین ایبک کو غلامی سے آزادی اور اختیار حکومت کے پروانے کے ساتھ سلطان کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔

وہ ہند کی اسلامی حکومت کا مقتدر اعلیٰ بنا اور اس کی تاج پوشی کی رسم، بمقام لاہور، 24 جون 1206ء کو ادا کی گئی۔ مسجد کے منبر سے اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور اس کے نام کے سکے جاری کیے گئے۔

جس وقت قطب الدین، سلطان بنا چند ایسی شخصیات موجود تھیں جو اپنے آپ کو سلطنت کا حق دار تصور کرتی تھیں۔ ان میں تاج الدین یلدوز، ناصر الدین قباچہ اور بنگال کا والی علی مردان سرفہرست تھے۔ قطب الدین ایبک نے ان حریفوں میں سے ایک یعنی تاج الدین یلدوز سے میدان میں مقابلہ کیا اور اسے شکست دی، لیکن پھر مصلحت اندیشی اور حالات کی نزاکت کے تحت اس نے یلدوز کی بیٹی قتلغ خانم سے عقد کر کے جنگ وجدال کے فتنے کو ختم کر دیا تھا۔

دوسرے حریف ناصر الدین قباچہ کے عقد میں اس نے اپنی بڑی بیٹی کو دے کر اس کو اپنا داماد بنا لیا۔ پھر بڑی بیٹی کی وفات کے بعد اس نے اپنی منجھلی بیٹی سے اس کا نکاح کر کے یہ رشتہ برقرار رکھا تھا اور اس رشتے کے استوار ہونے کے بعد طاقت کی رسہ کشی ختم ہو گئی تھی۔ اسی طرح اس نے علی مردان سے بھی نہایت اچھے دوستانہ تعلقات استوار کر لئے تھے خصوصاً اس کے لے پالک بیٹے آرام شاہ کی علی مردان سے بہت اچھی دوستی تھی۔

اس حکمت عملی کا نتیجہ بہت خوش گوار نکلا تھا۔ ملک میں امن قائم ہو گیا تھا اور ہندوستان کا تعلق غزنی اور غور سے الگ ہو کر خودمختار اسلامی سلطنت قائم ہو گئی تھی۔

قطب الدین ایبک ہندوستان میں اسلامی حکومت کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ ایک صاف دل، رعیت پرور اور انصاف پسند حکمران تھا۔ گرچہ اس کا زیادہ وقت فوجی مہمات اور امور ملکی میں صرف ہوا، لیکن اس کو علم وادب اور شعر وشاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ وہ غریبوں کا دستگیر اور معاون تھا۔ اس کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ وہ لاکھوں کی رقم غریبوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ اسی بنا پر اس دور کے مورخین نے اسے "لکھ بخش" کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ اس کے قلب ونظر میں رواداری اور وسعت تھی، ہندوؤں کو اس کے دور میں ہر طرح کی سہولتیں حاصل تھیں۔ ہر طرف خوشحالی اور امن وامان کا دور دورہ تھا۔ راہ گزر اور راہ گزار محفوظ تھے۔ ملک قذاقوں اور ڈاکوؤں کے وجود سے خالی تھا۔

قطب الدین ایبک نے فن تعمیر کی طرف بھی توجہ دی تھی اور دہلی کو خوبصورت عمارات سے مزین کیا۔ ان عمارات میں مسجد قوت الاسلام، قطب مینار اور اڑھائی دن کا جھونپڑا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

"قطب مینار" کو اس نے صوفی بزرگ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی یادگار کے طور پر بنوایا تھا۔ یہ 242 فٹ اونچا ہے۔ اس پر قرآن حکیم کی آیات کندہ ہیں، قطب الدین ایبک اس کو مکمل نہ کروا سکا۔ اس کے بعد التتمش نے اسے مکمل کروایا تھا۔

قطب الدین ایبک کو حکمران کی حیثیت سے چار سال (1206ء تا 1210ء) سے زیادہ حکومت کرنے کی مہلت نصیب نہ ہوئی۔

اس شام وہ لاہور میں اپنے پسندیدہ کھیل یعنی چوگان کھیلنے میں مصروف تھا کہ گھوڑا قلابازی کھا کر اس طرح گرا کہ سلطان گھوڑے کے نیچے دب گیا۔ زین کا پیش کوبہ سلطان کے سینے میں جا گھسا، جس کی مہلک ضرب سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ ہندوستان میں اسلامی مملکت کے اس پہلے تاجدار کی قبر لاہور میں ہے۔

☆......☆......☆

قطب الدین ایبک کی وفات پر اس کی اولاد نرینہ کی عدم موجودگی میں امراء نے اس کے لے پالک بیٹے آرام شاہ کو 1210ء میں دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔

آرام شاہ نے نہایت نااہلی اور نالائقی کا ثبوت دیا۔

اسے ملکی مسائل اور حکومتی امور سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تمام وقت لہو ولعب میں مصروف رہتا۔ اس کے ابن الوقت قسم کے مصاحبین اس کے لئے شراب وشباب کے انصرام میں لگے رہتے۔ کچھ ہی دنوں میں قصر شاہی دہلی کی حسین اور نوعمر رقاصاؤں کا اڈا بن گیا۔ آرام شاہ شب وروز شراب کے نشے میں دھت شباب کے سرور میں گم رہتا۔

پوری سلطنت میں بدامنی اور بے چینی کا دور دورہ تھا۔ عوام الناس نے من مانی شروع کر دی تھی۔ چور، ڈاکو اور قذاق دن دھاڑے لوٹ مار مچاتے پھر رہے تھے۔ اشیائے خورونوش کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ ہر سمت عجب آپا دھاپی اور افراتفری کا عالم تھا۔

عام شہری کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔ نہ کسی کی جان محفوظ تھی، نہ مال وعزت...... دہلی کے لوگوں نے آرام شاہ جیسے نکمے شرابی اور عیش پرست سلطان کو اپنا حکمران ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر آرام شاہ کو کسی بات کی پروا نہ تھی، وہ اپنے عشرت کدے میں عیش ونشاط میں ڈوبا ہوا تھا۔

غروب ہوتے سورج کی زرد کرنیں قصر ایبک کے اونچے برجوں کو الوداعی بوسہ دیتی رخصت ہو رہی تھیں۔ قصر کے اونچے چوباروں سے سرمئی شام، سج سج قدم دھرتی، دھرتی پر اتر رہی تھی۔ شام کی مدھر اور نرم ہوا کے جھونکوں میں ایک عجب سی بے کلی کی کیفیت پوشیدہ تھی۔ دہلی کے کوچہ وبازار میں چھایا سکوت کسی بڑے طوفان کی نشان دہی کر رہا تھا۔

دربار ایبک کے سن رسیدہ، زمانے کے سرد وگرم چشیدہ، دانا وعاقل امراء امیر علی اسماعیل اور داؤد ویلمی اس وقت آرام شاہ سے ملاقات کی غرض سے، قصر شاہی کی نشست گاہ میں موجود تھے اور کوئی گھنٹے بھر سے سلطان آرام شاہ سے شرف ملاقات کی امید میں انتظار کی سولی پر لٹکے ہوئے تھے۔

"سلطان معظم اس وقت اپنے قدموں سے چل کر نشست گاہ میں آنے کے قابل نہیں ہیں۔" کافی دیر بعد ایک غلام نے آکر اطلاع دی۔ "سلطان کا حکم ہے کہ اگر آپ لوگوں کی ان سے ملاقات اتنی ہی ضروری ہے تو، آپ دونوں ان کے ایوان خاص میں تشریف لے چلیں۔"

داؤد ویلمی اور علی اسماعیل نے ایک دوسرے کی طرف پُرتاسف نظروں سے دیکھا اور مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق سلطان کے عیش کدے میں جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

سلطان اس وقت اپنے عشرت کدے میں عیش وعشرت میں مصروف تھا۔ کئی نوخیز ودل آویز دوشیزائیں اس کے پہلو میں موجود تھیں، جبکہ اس کے سامنے چاندی کی تپائی پر ساغر ومینا دھرے تھے۔

کمرے کی فضا میں عطر وپھلیل کی باسی خوشبو کے ساتھ شراب کی تازہ بساند بسی ہوئی تھی۔ دائیں جانب ایرانی غالیچے پر دو رقاصائیں رقص پیش کر رہی تھیں، جبکہ بائیں جانب طبلہ وسارنگی نوازوں کے ساتھ ایک خوش شکل خوش گلو مغنیہ راگ الاپنے میں مصروف تھی۔ اس خواب گاہ کی، خوابناک فضا میں عجب گناہ آلود سا، مدہم سا اندھیرا ابھرا ہوا تھا۔

علی اسماعیل اور داؤد ویلمی آہستگی سے اندر داخل ہوئے، ان دونوں کو دیکھ کر آرام شاہ قدرے کسمساتا ہوا سیدھا ہوا......

"آپ لوگ جانتے ہیں، یہ وقت ہماری مصروفیت کا ہوتا ہے۔" آرام شاہ لڑکھڑاتے لہجے میں قدرے ناخوشگوار انداز میں بولا۔ "بھلا ایسے میں ہمیں پریشان کرنے کی ایسی کیا ضرورت آ پڑی تھی......؟"

"آپ تو چوبیس گھنٹے اسی طرح کی مصروفیات میں ڈوبے رہتے ہیں۔" بوڑھے داؤد ویلمی نے خشک اور سرد لہجے میں جواب دیا۔ "نہ دربار لگاتے ہیں، نہ ہی امراء ووزراء سے ملاقات کرتے ہیں، آخر، پھر آپ سے ملنے کی صورت کیا ہو؟"

اس کے خشک اور سرد لہجے سے متاثر ہو کر آرام شاہ فراخدلانہ لہجے میں بولا...... "چھوڑیے سب شکوے شکایتیں، آیئے! آپ بھی اس محفل رنگ وبو سے حظ اٹھایئے......اور لطف اندوز ہوئیے......"

"سلطان معظم! ہم یہاں اس محفل سے لطف اندوز ہونے نہیں آئے ہیں۔" علی اسماعیل نے قدرے تیز اور درشت لہجے میں کہا۔ "ملک کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ دہلی کے مضافات میں ہندو اور راجپوت امراء بغاوت کے لئے کمربستہ ہیں۔ دوسری طرف بنگال کے حاکم علی مردان نے خودمختاری کا اعلان کر دیا ہے......"

"نہیں......نہیں۔" آرام شاہ خمار آلود آنکھوں اور لڑکھڑاتی زبان سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے گویا ہوا۔ "علی مردان تو ہمارا جگری دوست ہے......وہ بھلا ایسی حرکت کس طرح کر سکتا ہے......"

"اور اگر میں یہ اطلاع دوں کہ ناصر الدین قباچہ بھی علم بغاوت بلند کرنے کو تیار ہے تو آپ فرمائیں گے کہ وہ تو ہمارا بہنوئی ہے، وہ ایسا کیونکر کر سکتا ہے؟" داؤد ویلمی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"ناصر الدین قباچہ اور تاج الدین یلدوز...... سب ہی ہمارے قرابت دار ہیں......" آرام شاہ نے نشے میں، ٹوٹتے لہجے میں کہا۔ "ہمیں سب پر اعتبار ہے...... آپ لوگوں کو بھی بلاوجہ کے خدشوں میں گھرنے کی ضرورت نہیں...... اب آپ لوگ ہمارے عشرت کدے میں آ ہی چکے ہیں...... تو...... آیئے، ہمارے ساتھ بیٹھیے......" اس نے علی اسماعیل کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے، لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔

"لاحول ولاقوۃ" بوڑھا علی اسماعیل لاحول پڑھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے داؤد ویلمی کا ہاتھ تھام کر واپسی کے لئے پلٹ گیا۔ ان دونوں کے پیچھے آرام شاہ کے مکروہ قہقہے گونج رہے تھے......

"بے وقوف بوڑھو! تاج وتخت اور حکومت وسلطنت جنگ وجدال اور فکر وخیال کے لئے نہیں ہوتے بلکہ عیش وطرب اور لطف ونشاط کے لئے ہوتے ہیں، جس نے موج میں، موج نہ لی وہ بعد میں پچھتاتا ہے...... اور میں پچھتانا نہیں چاہتا...... میں عیش کوشی کے ان لمحوں سے مسرت وانبساط کا قطرہ قطرہ کشید کر لینا چاہتا ہوں۔"

☆......☆......☆

"اب آپ ہی بتایئے، ان حالات میں کیا کیا جائے؟" داؤد ویلمی نے نشست گاہ میں آکر، ایک چوکے پر ڈھیر ہوتے ہوئے علی اسماعیل سے سوال کیا۔ اس کے چہرے سے مایوسی اور اذیت چھلک رہی تھی، جبکہ آنکھوں سے تاسف اور پچھتاوا مترشح تھا۔

"میں نے بھی آرام شاہ کو سلطان کی اس مسند پر بٹھانے کی تگ ودو کی تھی، میں اپنی اس غلطی کے لئے خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گا......"

"جو ہو چکا سو ہو چکا۔" علی اسماعیل نے پُرسوچ لہجے میں جواب دیا۔ "اب سوچنا یہ ہے کہ آگے کیا کرنا چاہیے...... حالات اسی ڈگر پر چلتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب اس سلطنت اسلامی کا خاتمہ ہو جائے گا......"

"خدانخواستہ" داؤد ویلمی نے جلدی سے کہا۔ پھر ذرا توقف کے بعد سوچتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میرے ذہن میں ایک مرد مومن کا نام ہے ......بس ایک وہی اس ڈوبتی نیا کا کھیون ہار ہو سکتا ہے...... وہی ایک ناخدا ہے جو اس ڈوبتے سفینے کو ساحل پر لگا سکتا ہے......"

"آپ کا اشارہ امیر الامراء شمس الدین التتمش کی طرف تو نہیں؟" علی اسماعیل نے ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے کہا۔

"جی۔" داؤد ویلمی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "آپ کیا کہتے ہیں؟"

"آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔" علی اسماعیل نے مسرور لہجے میں جواب دیا۔ "کل رات حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے آستانے پر حاضر ہوا تھا۔ ان کی طرف سے بھی کچھ ایسا ہی اشارہ ملا ہے۔"

"پھر دیر کس بات کی ہے؟" داؤد ویلمی نے بے تاب لہجے میں کہا۔ "دیگر درباری ارکان کو اعتماد میں لے کر عملی قدم اٹھایئے، اب ذرا سی بھی تاخیر کی گنجائش نہیں ہے۔"

چنانچہ امرائے دہلی نے شمس الدین التتمش کو دہلی کے تخت وتاج سنبھالنے کی دعوت دی۔ یہ پیغام پا کر التتمش سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ وہ ایک فقیر منش انسان تھا، اسے تخت وتاج سے رغبت تھی نہ ضرورت...... اس دعوت نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

اسے متفکر اور سوچوں میں گھرا دیکھ کر، ماہ نور بانو نے حیران لہجے میں سوال کیا تھا۔

"آپ کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں، کیا میں پریشانی کا سبب جان سکتی ہوں؟"

"تم میری شریک حیات ہو۔" التتمش ماہ نور کی طرف متوجہ ہوتا ہوا دھیمے لہجے میں بولا۔ "فرمان الٰہی ہے...... مرد وزن کو ایک دوسرے کے لئے لباس بنایا گیا ہے...... تو پھر میں تم سے کوئی راز کس طرح پوشیدہ رکھ سکتا ہوں......" پھر التتمش نے دھیمے لہجے میں امرائے دہلی کی خواہش اپنی چہیتی زوجہ کے گوش گزار کر دی تھی......

"بے شک آپ کو کسی سلطنت کی ضرورت نہیں۔" ماہ نور نے ساری بات سن کر دوٹوک لہجے میں کہا۔ "مگر سلطنت وحکومت کو آپ جیسے ہی کسی حکمران کی ضرورت ہے، اس مشکل گھڑی میں اگر آپ نے سلطنت کی ڈوبتی کشتی کو سنبھالنے کا بیڑہ نہ اٹھایا تو یہ سمجھ لیجئے کہ سرزمین ہندوستان پر یہ پہلی اسلامی حکومت، آخری ثابت ہو گی۔"

ماہ نور بانو کے مشورے نے التتمش کے لئے سوچ کی ایک نئی راہ کھول دی تھی۔ تب اس نے امرائے دہلی کی پیشکش قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ صورت حال دیکھ کر آرام شاہ نے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی، لیکن اراکین سلطنت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ پھر آرام شاہ اپنے احباب اور بہی خواہوں کی ایک جماعت لے کر آمادۂ پیکار ہوا۔

دہلی کے نزدیک "جوڑ" کے میدان میں التتمش اپنی فوج کے ساتھ صف آراء ہوا اور آرام شاہ کو ایک معمولی سی جھڑپ میں شکست دے کر فاتحانہ انداز میں دہلی میں داخل ہوا۔

اس معرکے میں آرام شاہ مارا گیا۔ اس نے دہلی پر صرف آٹھ ماہ حکومت کی۔

1211ء میں شمس الدین التتمش، دہلی کے تخت پر متمکن ہوا۔

محمد غوری کے دربار میں فروخت کے لئے لاتے وقت، اس کے آقا حاجی جمال الدین چست قبا نے روا روی میں ایک جملہ کہا تھا۔ "کون جانے آج کا یہ غلام کل کا سلطان ہو۔" اس کا انجانے میں کہا گیا یہ جملہ قدرت کا فیصلہ بن گیا تھا۔ آج وہی غلام، دہلی کے تخت پر، سلطان کی حیثیت سے جلوہ گر تھا۔

تخت نشین ہوتے ہی التتمش مشکلات کے نرغے میں گھر گیا تھا۔

آرام شاہ کے دور حکومت میں سلطنت کے حالات بگڑتے چلے گئے تھے، بالخصوص آرام شاہ اور التتمش کے درمیان تاج وتخت کی کشمکش کی وجہ سے حالات مزید خراب ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان حالات میں، علی مردان نے بنگال میں خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ ساتھ ہی مالوہ اور رنتھمبور میں بھی بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے۔

دوسری جانب ناصر الدین قباچہ نے جو ملتان اور سندھ پر قابض تھا، بھٹنڈا، اکرام، سوسا اور لاہور پر بھی قبضہ کر لیا۔ اسی اثناء میں تاج الدین یلدوز والی غزنی نے ایک چال چلی۔ وہ یہ کہ اس نے التتمش کو اپنی طرف سے ایک تاج اور چھتر شاہی روانہ کیا جس سے اسے التتمش کو یہ جتانا اور بتانا مقصود تھا کہ التتمش ابھی بھی دولت غزنی کے ماتحت ہے۔

یلدوز، والی غزنی کی طرف سے مملکت ہند پر حکومت کرنے کی اجازت پانا دراصل التتمش کی خودمختار حکومت کی توہین تھی۔ اس کا برافروختہ ہونا یقینی تھا۔ اس عالم میں اس کی چاہنے والی وفادار بیوی ماہ نور بانو، لحہ بہ لحہ اس کے ساتھ تھی اور پل پل اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

"اس کی اس معمولی اور اوچھی حرکت پر آخر آپ اتنے خفا کیوں ہیں؟" وہ تسلی دینے والے انداز میں خاوند کے شانے کو تھپکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"تم نہیں جانتیں بیگم، یلدوز کی سیادت تسلیم کرنا، ماتحتی اختیار کرنے کے مترادف ہی نہیں، بلکہ اس سے علاؤ الدین خوارزم شاہ اور منگول حملہ آوروں کا خطرہ بھی پیدا ہو سکتا ہے......"

"اوہ۔" ماہ نور بانو کے لب پُرتشویش انداز میں سکڑ گئے۔

ان دنوں وہ امید سے تھی، اس کی طبیعت کے پیش نظر التتمش اس کی طرف دیکھ کر تشفی بھرے لہجے میں بولا۔ "ان حالات میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، مسبب الاسباب پروردگار ہمارے ساتھ ہے...... میں حضرت بختیار کاکیؒ سے مشورے کے بعد، اس مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں گا......"

☆......☆......☆

سب سے پہلے التتمش نے دہلی کے قریب فوجی بغاوت کو زیر کیا اور اس طرح دہلی پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔

اس کے بعد اس نے تاج الدین یلدوز کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔

تاج الدین، محمد غوری کا ایک غلام تھا، محمد غوری کی وفات کے بعد اس کے بھتیجے غیاث الدین نے اسے غزنی کا علاقہ دے دیا تھا۔ 1214ء میں جب خوارزم شاہ نے تاج الدین یلدوز کو غزنی سے نکال باہر کیا تو وہ لاہور آ گیا، لاہور پر ان دنوں قباچہ کی حکومت تھی، یلدوز نے قباچہ کے حاکموں کو نکال کر پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ اب وہ اپنی خودمختار حکومت کا اعلان کرنا چاہتا تھا۔

"تاج الدین یلدوز کو اس کے اس امر سے روکنا ازحد ضروری ہے۔" دربار دہلی کے بوڑھے امیر علی اسماعیل نے پُرسوچ نظروں سے التتمش کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں اپنے خیال کا اظہار کیا۔ التتمش اس وقت اپنے مشیران کے ساتھ ایوان خاص میں موجود درپیش صورت حال پر مشاورت میں مصروف تھا۔

"لیکن، تاج الدین یلدوز کی صاحب زادی قتلغ خانم جو سلطان قطب الدین ایبک کی بیوہ ہیں، وہ اب بھی قصر میں موجود ہیں۔" امیر داؤد ویلمی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "اور وہ ملتمس ہیں کہ ان کے والد گرامی کے ساتھ رحم اور درگذر کا رویہ روا رکھا جائے۔"

"ہم سلطان مرحوم کی بیوہ قتلغ خانم کا احترام کرتے ہیں۔" التتمش نے داؤد ویلمی کی بات سن کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اسی لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک، خود تاج الدین یلدوز کی طرف سے پیش قدمی نہ کی جائے، ہم اپنی جانب سے کوئی پیش رفت نہ کریں گے۔"

پنجاب پر قابض ہو جانے کے بعد یلدوز کی جانب سے سلطنت دہلی کے لئے خطرات بڑھ گئے تھے، مگر التتمش اپنے وعدے پر قائم تھا۔

فرقت کے ان لمحوں میں جب ماہ نور بانو قصر سلطان میں بالکل تنہا اور کرب وملال کے بھنور میں گھری ہوئی تھی ان لمحوں میں قتلغ خانم نے انتہائی اپنائیت اور ہمدردی سے اس کا ساتھ دیا تھا۔ ایک طرح دیکھا جائے تو، التتمش سے عقد کا عندیہ بھی اسی نے دیا تھا، اور ماہ نور کی یہ قابل رشک ازدواجی زندگی اسی کی مرہون منت تھی۔ اس احسان وعنایت کا تقاضا تھا کہ ان مشکل حالات میں اس کے بوڑھے باپ تاج الدین سے رحم اور درگذر کا رویہ روا رکھا جائے۔

شمس الدین التتمش کی جانب سے خاموشی اختیار کیے جانے کے باوجود تاج الدین یلدوز نے دہلی کی جانب فوج کشی کا فیصلہ کیا۔

اب مقابلہ ناگزیر تھا، سو التتمش فوج کثیر لے کر روانہ ہوا اور تراوڑی کے مقام پر یلدوز سے مقابلہ ہوا۔ شمس الدین التتمش نے نہایت بہادری اور جوانمردی سے یلدوز کی ٹڈی دل فوج کا مقابلہ کیا۔ شام تک معرکہ جاری رہا اور سورج کے غروب ہونے تک تاج الدین یلدوز کے مقدر کا سورج بھی غروب ہو گیا۔ اس کے بڑے بڑے سپہ سالار گرفتار ہوئے اور یلدوز جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ تائید الٰہی سے فتح ونصرت سلطان شمس الدین التتمش کے قرین حال ہوئی۔

التتمش کے دہلی پہنچتے ہی، تاج الدین یلدوز کو بھی گرفتار کر کے دہلی لایا گیا اور قتلغ خانم کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے قتل کرنے کے بجائے، بدایوں کے قید خانے میں قید کر دیا گیا۔

قتلغ خانم کی زندگی کا اب کوئی مقصد نہ رہا تھا۔ سو اس نے ماہ نور بانو سے گزارش کی کہ اسے بھی اس کے باپ تاج الدین یلدوز کے پاس بدایوں بھیج دیا جائے، وہ اپنی زندگی کے بقیہ دن، باپ کی خدمت میں گزارنے کی خواہاں ہے...... سو اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے، التتمش نے اسے بدایوں بھیج دیا۔ جہاں وہ یلدوز کی وفات تک اسی کے ساتھ رہی۔ پھر طویل علالت کے بعد یلدوز نے اسی قید خانے میں وفات پائی اور التتمش کے لئے انتقام، غصہ، نفرت اور جنگ وجدال کا یہ باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ تاج الدین یلدوز کے انتقال کے بعد بھی التتمش نے تمام عمر قتلغ خانم کے ساتھ شفقت والتفات کا رویہ روا رکھا۔

☆......☆......☆

ماہ نور بانو، ایک اور بیٹے جس کا نام، اس کے نانا، قطب الدین ایبک کے نام پر قطب الدین رکھا گیا تھا، کی ماں بن گئی تھی۔ بڑا شاہ زادہ ناصر الدین محمود، التتمش کو جس طرح بے حد عزیز تھا، اسی طرح، چھوٹا شاہ زادہ، قطب الدین اپنی ماں، ماہ نور کو بے حد پیارا تھا۔

ماہ نور کو پھلتے پھولتے دیکھ کر شاہ ترخان کے سینے پر سانپ لوٹتے تھے۔ ماہ نور کے بعد دیگرے، ایک بیٹی اور پانچ بیٹوں کی ماں بن چکی تھی، جبکہ وہ بمشکل تمام، ایک بیٹے رکن الدین فیروز کو ہی جنم دے سکی تھی۔

بچے اب بڑے ہو رہے تھے، ناصر الدین محمود اور رضیہ ذہانت وفطانت میں یکتا تھے اور دونوں علم وادب کا شوق رکھتے تھے۔ شمس الدین التتمش اپنے ان دونوں بڑے بچوں سے ازحد انسیت رکھتا تھا۔

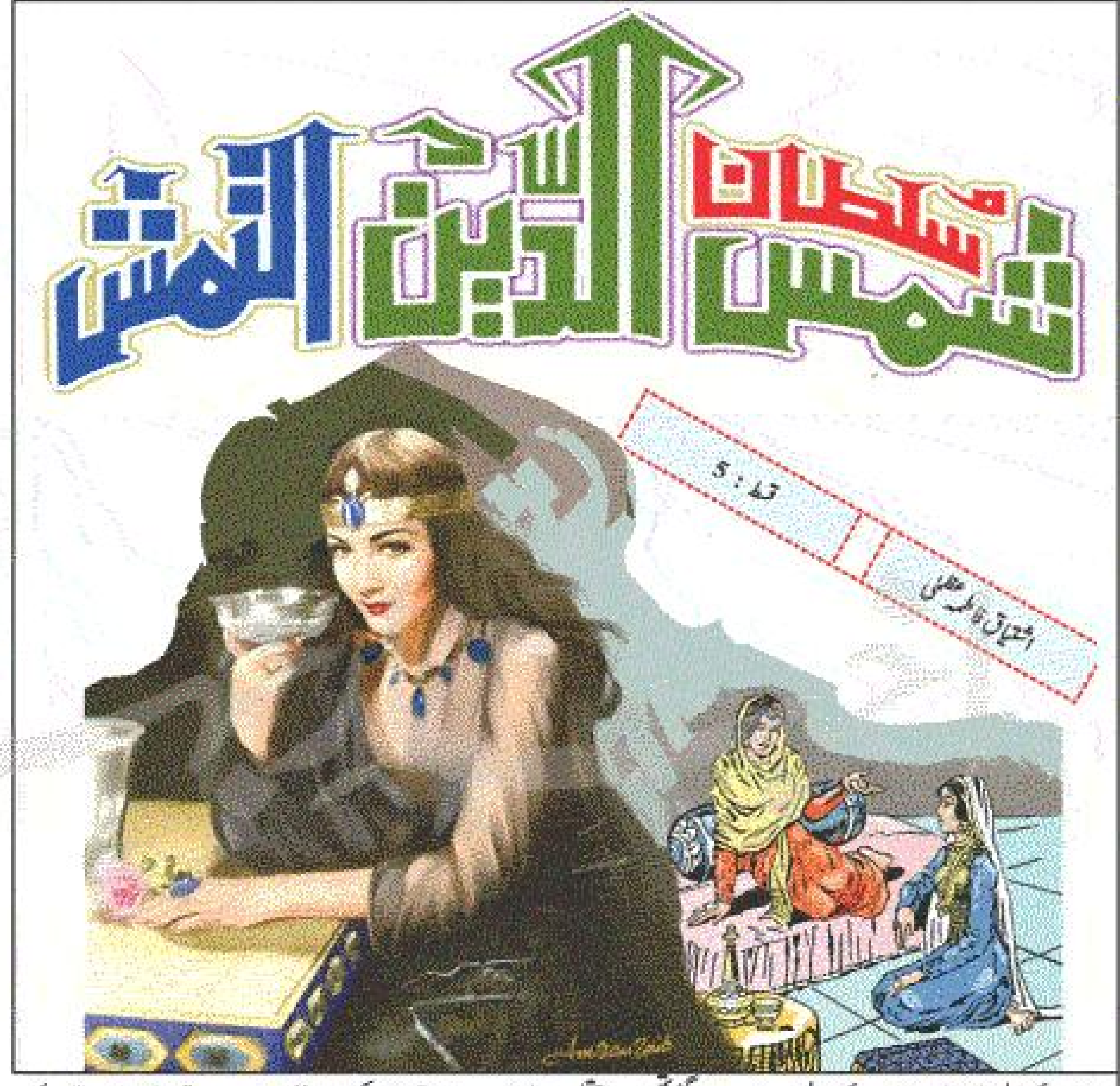
شاہ ترخان کو اس بات کا بھی سخت قلق تھا کہ اس کا بیٹا رکن الدین ایک ناقص الذہن اور بداطوار بچہ تھا۔ اس کے بے جا لاڈ پیار نے اسے بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ناپسند کرنے کے باوجود، شاہ ترخان کا دل رکھنے کے لئے التتمش، رکن الدین سے بھی کرم والتفات سے پیش آتا تھا اور اس کی بہتری اور ترقی کا خواہاں رہتا تھا۔

انہی دنوں ترکیہ سے کچھ کنیزیں قصر میں لائی گئیں۔ ہم وطن ہونے کے ناتے شاہ ترخان انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

(جاری ہے)

ان میں سے ایک کنیز شمسی نام کی تھی۔ دہکتے سورج کی طرح اس کا حسن ہر کس و ناکس کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا تھا۔

شاہ ترخان نے اسے اپنی خاص کنیز بنا لیا۔ اسے مثلِ دوست رکھتی اور اپنے ہر راز میں شریک کرتی تھی۔ شمسی حسین ہی نہیں، ایک ذہین لڑکی بھی تھی، جلد ہی اسے شاہ ترخان کی بد طینتی اور بد فطرتی کا اندازہ ہو گیا



اور اس کے دل میں شاہ ترخان کے لئے دوری پیدا ہو گئی تھی۔ وہ حتیٰ الامکان کوشش کرتی کہ کسی طرح شاہ ترخان کو راہ راست پر لا سکے مگر شاہ ترخان کسی بھی صورت اچھا سوچنے کو تیار نہ تھی۔

اس شام شمسی، شاہ ترخان کے غسل کی خاطر کنویں سے پانی نکال رہی تھی کہ اس نے ماہ نور کے رہائشی حصے کے سامنے والے باغیچے میں اسے اپنے چھوٹے بیٹے قطب الدین کے ساتھ ٹہلتے دیکھا۔ ننھے شہزادے کی کشش شمسی کو بے اختیار ماہ نور کے پاس لے گئی۔

ملکہ کے قریب پہنچ کر اس نے نہایت ادب و احترام سے سلام پیش کیا تھا اور ننھے شہزادے کو گود میں لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔

''ضرور۔'' ماہ نور بانو مشفق انداز میں مسکرائی۔ ''تم غالباً شاہ ترخان کی کنیز شمسی ہو؟''

''جی ملکہ عالیہ!'' شمسی نے جلدی سے جواب دیا۔ ''ترکیہ سے چند کنیزیں قصر میں بھیجی گئی تھیں، ملکہ شاہ ترخان نے بصد لطف و کرم اس ناچیز کو اپنی غلامی میں لے لیا۔''

''وہ خوش نصیب ہیں کہ جنہیں تم جیسی اچھی کنیز میسر ہو۔'' ماہ نور اسے ستائش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ شمسی کو ننھے شہزادے سے محبت بھرے انداز میں کھیلتے دیکھ کر اس نے کہا۔ ''تم جب چاہو ننھے شہزادے سے کھیلنے اور ہم سے ملنے ہمارے قصر میں آسکتی ہو، تمہیں دیکھ کر اور تم سے مل کر ہمیں یقیناً خوشی ہوگی۔''

شمسی کی حسین اور گہری آنکھیں اس عنایت پر پانی سے بھر گئیں۔

شاہ ترخان، ماہ نور بانو کو جس انداز سے پیش کرتی تھی، وہ اس کے بالکل برعکس تھی۔ شہزادہ قطب الدین اسے بے حد اچھا لگا تھا، سو اب جب بھی اسے موقع ملتا، وہ ماہ نور بانو کی خدمت میں حاضر ہو جاتی تھی اور کچھ دیر قطب الدین سے کھیل کر واپس لوٹ آتی تھی۔

شاہ ترخان کو اس کی اس مصروفیت کا بخوبی علم تھا مگر وہ کچھ سوچ کر اسے ڈھیل دیئے جا رہی تھی۔ اس نے اس سلسلے میں شمسی سے کوئی باز پرس نہیں کی، اس کے ذہن میں ایک زہر بھرا منصوبہ تیار ہو رہا تھا۔

ایک شام وہ شاہ ترخان کے ساتھ اس کے مطبخ خانے میں موجود تھی۔ اچانک اس نے شمسی سے سوال کیا۔ ''سنا ہے تم ملکہ ماہ نور سے ملنے اکثر جاتی رہتی ہو؟''

''وہ تو ملکہ ہیں بھلا ان سے میری کیا نسبت، البتہ ننھا شہزادہ مجھے بہت عزیز ہے، میں ان سے کھیلنے کبھی کبھار اس طرف چلی جاتی ہوں۔''

''اچھا......!'' شاہ ترخان نے دل جلے انداز میں سر ہلایا۔ ''وہ بدبخت بچہ تمہیں بھی بے حد عزیز ہے، سنا ہے اس کی ماں بھی اس پر جان چھڑکتی ہے۔''

''جی ہاں۔'' شمسی سادہ لوحی سے گویا ہوئی۔ ''جس طرح سلطان معظم اپنے بڑے صاحبزادے ناصر الدین محمود اور اکلوتی صاحبزادی رضیہ بیگم کو بے حد چاہتے ہیں، اسی طرح ماہ نور بانو بیگم اپنے چھوٹے بیٹے قطب الدین پر جان نثار کرتی ہیں۔''

''مجھے ان دونوں سے نفرت ہے۔'' شاہ ترخان نے نفرت بھرے انداز میں سوچا۔ ''میں ان دونوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتی ہوں۔'' پھر بے ساختہ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ اپنی تلخ سوچ کو شیریں مسکراہٹ سے ڈھانپتے ہوئے نرم لہجے میں بولی۔ ''پھر تو تمہیں ماہ بانو بیگم اور ان کے چہیتے کیلئے کھانے کی کوئی چیز لے کے جانا چاہئے۔''

''میں سمجھی نہیں؟'' شمسی نے حیرت سے سوال کیا۔

''میں سمجھاتی ہوں۔'' شاہ ترخان نے چاندی کے ایک بڑے گلاس میں دودھ انڈیلا، پھر اس میں مختلف قسم کے میوہ جات کا سفوف شامل کیا۔ پھر اس میں کھانڈ گھولتے ہوئے شمسی سے مخاطب ہوئی۔ ''اس مشروب کو ''شاہی شیر شیریں'' کہتے ہیں اور ماہ نور بانو کو یہ مشروب بے حد مرغوب ہے، تم اسے لے کر اس کی خدمت میں جاؤ گی تو وہ بے حد خوش ہوگی اور تمہارا دل رکھنے کی خاطر نہ صرف یہ دودھ وہ خود پیئے گی بلکہ اپنے لاڈلے لختِ جگر کو بھی پلائے گی۔''

پھر شاہ ترخان نے کنیز شمسی سے کہا۔ ''ذرا اندر سے سرپوش تو لانا۔'' اور جوں ہی شمسی اندر گئی، شاہ ترخان نے اپنے لباس میں چھپائی ہوئی ایک چھوٹی سی شیشی نکالی، اس میں سریع الاثر زہر تھا۔ شاہ ترخان نے شیشی میں موجود سارا سفوف دودھ میں انڈیل کر چمچے سے اچھی طرح اس میں حل کر دیا۔

''اس سم قاتل کے ایک گھونٹ کے حلق سے اترتے ہی موت واقع ہو جائے گی۔'' شاہ ترخان زیر لب بڑبڑائی۔ ''اور ماہ نور کے قتل ہوتے ہی شمسی کو اس جرم کے پاداش میں گرفتار کر لیا جائے گا۔''

دروازے کی اوٹ میں کھڑی شمسی یہ سب دیکھ اور سن رہی تھی۔ اس کا ننھا سا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا جبکہ چہرہ ہلدی کی مانند زرد ہو گیا تھا۔ شاہ ترخان کے اس بدترین فعل پر غصے سے زیادہ اسے تعجب تھا، وہ لرزیدہ قدموں سے اندر داخل ہوئی۔

''آپ نے اس شیر شیریں میں، کیا شامل کیا ہے؟'' اس نے واضح آواز میں اس سے سوال کیا۔ ''غالباً کوئی تیز اثر زہر......؟''

''اوہ! تو تم نے سب دیکھ اور سن لیا ہے؟'' شاہ ترخان نے بغیر گھبرائے دھیمے لہجے میں کہا، پھر لحظہ بھر کے توقف کے بعد وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ ''یہ بھی اچھا ہوا، برا نہ ہوا، اس طرح اب تمہیں اس شیر کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا، اب تمہیں یہ کام انتہائی ہوشیاری اور چابک دستی سے کرنا ہوگا۔'' وہ شمسی کے کچھ اور قریب کھسکتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ''یہ دودھ ہر حال میں ماہ نور بانو کو نوش جان کروانا ہے......اگر تم نے کسی طرح کی چالاکی یا کوتاہی کا مظاہرہ کیا تو میں تمہیں دہکتے آتشدان میں زندہ جھونک دوں گی۔''

شمسی کے چہرے کا رنگ اڑتا جا رہا تھا اور ہاتھ، پیر ٹھنڈے پڑتے جا رہے تھے۔

''میں جانتی ہوں تم ایک ذہین لڑکی ہو۔'' چند لمحوں تک شمسی کا زرد چہرہ تکتے رہنے کے بعد شاہ ترخان نے کھوردرپن سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم زندہ جل کر خاکستر ہونے کی نسبت یہ شیر شیریں ماہ نور کو پلانا پسند کرو گی۔''

''ج......جی......!'' شمسی نے لرزتے ہاتھوں سے وہ طشتری اٹھائی، جس میں سبز سرپوش سے ڈھکا چاندی کا گلاس دھرا تھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ شمسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس مشکل گھڑی میں آخر کرے تو کیا کرے؟

آگے کنواں تھا اور پیچھے کھائی...... ماہ نور کو زہر آلود دودھ پلا دیتی تو بھی اس کے قتل کے جرم میں گرفتار ہوتی اور آخر کار قتل کر دی جاتی اور اگر شاہ ترخان کی حکم عدولی کرتی تو بھی وہ اسے جینے نہ دیتی۔

وہ اسی عالم پریشانی میں سر جھکائے لرزیدہ قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی تب ہی اس کی نگاہ سلطان التمش پر پڑی۔ وہ طویل غلام گردش سے گزر کر اپنی نشست گاہ کی سمت جا رہا تھا۔ شمسی ایک دم سے اپنی جگہ تھم گئی تھی، کئی لمحوں تک ایک نقطے پر دل و دماغ کو مجتمع کر کے اس نے کچھ سوچا پھر وہ ایک فیصلہ کر کے مضبوط قدموں سے سلطان کی نشست گاہ کی طرف روانہ ہو گئی۔

دستک کی آواز پر سلطان نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ ''دروازہ کھلا ہے، اندر آجاؤ۔'' سلطان کی اجازت پا کر شمسی دھیمے قدموں اندر داخل ہوئی تھی۔

''کون......؟'' سلطان نے اس کی سمت نگاہ کئے بغیر سوال کیا تھا۔

''سلطان محترم! میں ایک ترک نژاد کنیز شمسی ہوں۔'' شمسی نے جلدی سے اپنا تعارف کروایا۔ ''اور میرے ہاتھ میں اس وقت ایک چاندی کا گلاس ہے، جس میں شیر شیریں ہے۔''

سلطان نے کنیز کی بات کو نہ سمجھتے ہوئے پلکیں جھپکائیں۔

''اور......اور دودھ میں زود اثر زہر ملا دیا گیا ہے۔''

شمسی کی بات پوری ہوتے ہی التمش چونک کر سیدھا ہوتا ہوا بولا۔

''یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟''

''مجھے میرے پیدا کرنے والے کی قسم، میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔'' شمسی نے سچے لہجے میں بات آگے بڑھائی۔ ''اور یہ زہر آلود دودھ مجھے، جس ہستی نے دیا، اس کا نام میں آپ کو نہیں بتاؤں گی، اس کا حکم ہے کہ میں یہ دودھ ملکہ ماہ نور کو پلا دوں اور موقع ملے تو چھوٹے شہزادے قطب الدین کو بھی......!''

''اوہ......!'' التمش کے لب تشویش اور اذیت بھرے انداز میں سکڑ گئے۔ ''میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے یہ دودھ ماہ نور بانو کو نہیں پلایا۔'' چند لمحوں تک خاموش رہ کر التمش نے کہنا شروع کیا۔ ''اور تیری اس بات نے بھی مجھے متاثر کیا کہ تو اس زہر ہلاہل کے دینے والے کا نام پردے میں رکھنا چاہتی ہے......اللہ بھی پردہ پسند کرتا ہے اس لئے میں تجھ سے وہ نام جاننے کے لئے اصرار نہیں کروں گا......اب بس اتنا بتا دے کہ تو کیا چاہتی ہے؟''

''کام نامکمل چھوڑ دینے پر اس زہر کو دینے والی ہستی میری جان کی دشمن بن جائے گی، میں آپ سے جان کی امان چاہتی ہوں۔'' شمسی نے گلاس ایک جانب رکھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے التجا کی۔

''ٹھیک ہے۔'' چند لمحوں تک گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد التمش نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ ''آج سے تو میرے قصر میں رہے گی اور یہاں کوئی بھی تیرا بال بیکا نہ کر سکے گا۔''

شمسی بے ساختہ التمش کے قدموں میں جھک گئی۔

جب صورتحال ماہ نور بانو کے سامنے آئی تو اس نے بے اختیارانہ شمسی کو اپنے گلے سے لگا لیا تھا اور اس نے از راہ عنایت اپنے چہیتے لختِ جگر قطب الدین کی تعلیم و تربیت اور پرورش کی ذمے داری اسے سونپ دی تھی۔

ساری کہانی جب شاہ ترخان کی سماعت تک پہنچی تھی تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو گئی تھی۔ وہ تو شمسی کو دہکتے آتشدان میں جھونک کر زندہ خاکستر کر دینا چاہتی تھی تا کہ خود اس کا دل جل بھن کر کباب ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

تاج الدین یلدوز کا قصہ پاک ہوتے ہی موقع غنیمت جان کر ناصر الدین قباچہ نے لاہور پر قبضہ کر لیا تھا۔ التمش ایک بڑی فوج لے کر قباچہ سے مقابلے کے لئے دہلی سے روانہ ہوا، اس سفر میں شہزادہ ناصر الدین محمود، شہزادہ قطب الدین، شہزادی رضیہ بانو بیگم اور ملکہ ماہ نور بانو بھی التمش کے ساتھ تھیں۔ قطب الدین کی وجہ سے شمسی بھی ہمراہ تھی۔ وہ قطب الدین کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتی تھی۔

یہ لشکر شاہی لاہور کے مضافات میں کھلے میدان میں خیمہ زن ہوا تھا۔

شمس الدین التمش کی آمد کی خبر سے ناصر الدین قباچہ کے چہرے پر تفکرات کے سائے لرزنے لگے تھے اور آنکھوں سے پریشانی و سراسیمگی ہویدا تھی۔ اس کی یہ کیفیت اس کی شریکِ حیات آمنہ بنت قطب الدین ایبک سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی۔

''سلطان التمش کے لشکر جرار سے آپ خائف ہیں؟'' اس نے شوہر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''اس کے لشکر اور میری افواج کا کوئی مقابلہ نہیں ہے......وہ سلطنتِ دہلی کا سلطان ہے اور میں......!'' ناصر الدین نے سر جھکا کر قطعیت سے سچائی کا اعتراف کیا۔

''جب آپ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ التمش کے لشکر سے آپ کی فوج کا کوئی مقابلہ نہیں تو پھر آپ مقابلہ کرنے پر کیوں مصر ہیں۔''

آمنہ نے حیران لہجے میں سوال کیا۔

''مقابلہ نہ کروں تو کیا کروں؟'' ناصر الدین نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''اسے اپنی فوج کو روندنے اور خود کو قتل کرنے کا موقع دے دوں؟''

''شاید آپ بھول رہے ہیں کہ التمش آپ کا مدمقابل ہی نہیں، وہ ہمارا قرابت دار بھی ہے۔'' آمنہ نے دھیمے اور رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ آپ کی چھوٹی سالی ماہ نور بانو کا شوہر ہے، اس حوالے سے ہم اس سے صلۂ رحمی کی توقع رکھ سکتے ہیں۔''

ناصر الدین قباچہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

اگلی دوپہر سے جنگ کا آغاز ہوا۔ ابتداء سے ہی التمش کی فوجوں کا پلہ بھاری تھا، قباچہ کی افواج بری طرح پسپا ہو رہی تھیں، ہزاروں سپاہی مارے گئے، سیکڑوں گھوڑے اور ہاتھی زخمی ہوئے۔ آخر شام ڈھلے تک جنگ اپنے انجام کو پہنچی۔ قباچہ کو شکست فاش کا منہ دیکھنا پڑا تھا اور وہ جان بچا کر ملتان اور سندھ کی طرف بھاگ گیا۔

التمش فاتحانہ انداز میں سر اونچا کئے لاہور میں داخل ہوا۔ قباچہ کے محل کا محاصرہ کر لیا گیا، جس میں اس کی بیگمات بشمول آمنہ اور بچے موجود تھے۔

جب ماہ نور کو آمنہ کی موجودگی کا علم ہوا تو اس کا دل بہن سے ملنے کے لئے تڑپ اٹھا۔ التمش نے کمال لطف و مہربانی سے اسے اپنی بہن اور اس کے بچوں سے ملنے کی اجازت دے دی تھی۔

آج برسوں بعد وہ دونوں بہنیں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ ماہ نور بانو بے تابانہ آمنہ کے سینے سے لگ گئی تھی۔ قطب الدین ایبک کے جہاں سے اٹھتے ہی اس کے خاندان کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ آرام شاہ اپنی کرتوتوں کے ہاتھوں لقمۂ اجل بنا اور آمنہ و ماہ نور بانو اپنے شوہروں کی باہمی چپقلش کے باعث جیتے جی ایک دوسری کی شکل تک دیکھنے سے محروم تھیں۔

''اس ملاقات کے بعد دل کو کیسا سکون ملا ہے۔'' آمنہ چھوٹی بہن کو سینے سے لگائے بولی۔ ''ایک وہ وقت تھا جب آٹھوں پہر ہم بہنیں ایک ساتھ ہوا کرتی تھیں، آج یہ وقت ہے کہ ہم برسوں کے بعد ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہی ہیں۔''

''آپا! کیا ایسی کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ یہ دوریاں ہمیشہ کیلئے قربتوں میں تبدیل ہو جائیں؟'' ماہ نور بانو نے حسرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں ایک صورت ہے۔'' آمنہ نے سوچتی ہوئی نظروں سے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے شوہر کو سمجھاؤں کہ وہ سلطان سے معافی مانگ کر صلح کے لئے آمادہ ہو جائے اور تم اپنے خاوند کو آمادہ کرو کہ وہ قباچہ کی معافی قبول کر کے اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھا دے۔''

التمش فطرتاً صلح جو اور رحم دل انسان تھا۔ اسے آمنہ کی تجویز پسند آئی تھی۔ آمنہ نے قباچہ سے رابطہ کر کے اپنی تجویز اس کے سامنے رکھی تھی، وہ بھی در در کی ٹھوکروں سے عاجز آ چکا تھا، اطاعت کے لئے آمادہ ہو گیا تھا۔

التمش نے صلۂ رحمی سے کام لیتے ہوئے قباچہ کو معاف کر دیا تھا اور اسے سندھ، ملتان اور مغربی پنجاب کے علاقوں کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

نیلگوں آکاش کے دامن میں جا بجا روپہلے تارے ٹنکے تھے اور چاند کا سنہرا جھومر پوری آب و تاب کے ساتھ دمک رہا تھا۔ رات کے پچھلے پہر کی ہواؤں کے نرم جھونکوں میں ایک تسکین آمیز خنکی رچی ہوئی تھی۔

سلطان التمش، حضرت بختیار کاکیؒ کے ساتھ تہجد کی نماز ادا کرنے میں مصروف تھا۔ نماز کے بعد وہ دونوں حجرے میں آ گئے تھے۔ التمش کی جھکی ہوئی نگاہوں سے جھانکتی فکر حضرت بختیارؒ کی جہاندیدہ اور برگزیدہ نظروں سے پوشیدہ نہ تھی، مگر وہ منتظر تھے کہ التمش خود ہی اپنے تفکر کا اظہار کرے مگر اس کی مسلسل خاموشی دیکھ کر آخر حضرت کو خود ہی بات کا آغاز کرنا پڑا۔

''تم خوارزم شاہ جلال الدین کی وجہ سے متفکر دکھائی دیتے ہو؟''

''جی اعلیٰ حضرت!'' التمش نے سادگی اور سچائی سے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''جلال الدین نے مجھ سے پناہ کی درخواست کی ہے، اسے پناہ دینے کی صورت میں منگولوں کے حملے کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے...... وہ اس کے تعاقب میں سندھ اور ملتان تک آ پہنچے تھے، کہیں آگے بڑھ کر سلطنت دہلی سے نہ آ ٹکرائیں؟'' التمش کی دھیمی آواز میں خدشے اور وسوسے لرزاں تھے۔

چنگیزی سلطنت اور ہندوستان کی اسلامی سلطنت کی بنیادیں تقریباً ایک ہی وقت میں ساتھ ساتھ قائم ہوئی تھیں۔ جس وقت ہندوستان میں قطب الدین ایبک نے تخت نشین ہو کر تاجِ شاہی سر پر رکھا تھا، عین اس وقت مغولستان میں تموچن (چنگیز خان) نے بھی اپنی سلطنت قائم کر لی تھی، چنانچہ چنگیز خان کی سرپرستی میں منگول قبیلے کے لوگ جو وسط ایشیاء کے خانہ بدوش، وحشی اور خونخوار قبائل سے تعلق رکھتے تھے، ایک جھنڈے تلے جمع ہو کر آس پاس کے علاقوں میں دھاوے بولنے لگے۔

انہوں نے ترکمانستان، خراسان، ایران اور عراق میں وہ خونریزی کی کہ تاریخ میں انہیں آج تک ''عذاب الٰہی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

انہوں نے التمش کے زمانے تک ایک وسیع سلطنت قائم کر لی تھی۔ پھر انہوں نے لاتعداد فوج کی صورت میں چنگیز خان کی سرکردگی میں خوارزم شاہ پر حملہ کر دیا اور طرفۃ العین میں اس کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ منگولوں کا یہ حملہ ایشیاء کی تاریخ میں بہت اہم خیال کیا جاتا ہے۔

اس حملے میں بلخ، بخارا اور سمرقند وغیرہ کی مکمل طور پر بربادی ہوئی اور کاشغر سے بغداد تک آگ لگا دی گئی، جس کے باعث بڑے بڑے شہروں کے تاخت و تاراج ہو جانے سے اسلامی تہذیب اور علوم کی بیش بہا کتابیں، قیمتی نسخے اور عمارات خاک ہو گئیں۔

منگولوں کا یہ حملہ ایک ایسا طوفان تھا کہ جس کے تند و تیز اثرات ہندوستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتے تھے اور اس کی وجہ جلال الدین تھا۔

خوارزم شاہی سلطنت ختم ہوئی تو علاؤ الدین شاہ خوارزم نے بحیرۂ قزوین کے ایک جزیرے میں پناہ لی، پر کچھ ہی عرصے بعد وہ راہیٔ ملک عدم ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا جلال الدین خوارزم شاہ برسر اقتدار آیا اور اس نے منگولوں کو شکست دی۔

لیکن چنگیز خان نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اسے دھکیلتا ہوا دریائے سندھ تک لے آیا۔ جلال الدین نے بے بس ہو کر اہل و عیال کو تو خدا کے بھروسے پر پیچھے چھوڑا اور خود گھوڑے کو ایڑ لگا کر چند جانثاروں کے ساتھ دریائے سندھ میں چھلانگ لگا دی۔

منگولوں نے اس کا تعاقب کیا۔

لیکن جلال الدین کمال جرأت سے منگول حملہ آوروں کے تیروں کی بارش تلے دریا کو صحیح و سالم عبور کر گیا۔

چنگیز خان اور اس کے ساتھیوں نے یہ منظر دیکھا اور انگشت بدنداں رہ گئے۔ یہاں تک کہ ان پر ایسی سراسیمگی اور رعب طاری ہوا کہ انہوں نے آئندہ پیش قدمی روک دی۔

دریائے سندھ کو عبور کر کے جلال الدین خوارزم شاہ نے سیالکوٹ سے آگے سندھ دوآب تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا، جس کا اکثر حصہ قباچہ کے تحت تھا۔

جلال الدین کا مقصد یہاں قبضہ کر کے حکومت قائم کرنا نہیں تھا بلکہ وہ یہاں سے آگے دہلی پہنچ کر التمش سے پناہ اور مدد کا خواستگار ہونا چاہتا تھا۔ اس کے دامن امید میں ابھی کچھ تار باقی تھے، اسے منگول حملہ آوروں کے خلاف التمش کی امداد پر بڑا بھروسہ تھا۔

لیکن التمش کا ذہن رسا اسے ہرگز یہ مشورہ دینے کو آمادہ نہ تھا کہ وہ منگولوں کے خلاف جلال الدین کو پناہ اور امداد دے کر منگولوں کو ہندوستان کے پیچھے لگا لے۔

اسی فکر میں التمش رات دیر تک جاگتا رہا تھا پھر ذرا دیر کو آنکھ لگی تھی، تب ہی تہجد کی نماز کے وقت آنکھ کھل گئی تھی۔ طبیعت میں عجب بے کلی تھی۔ ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہی اسے حضرت بختیارؒ کے آستانے پر جا کر سکون ملتا تھا، سو وہ اٹھ کر ان کے آستانے کی طرف چل دیا تھا۔

اس وقت حضرت تہجد کیلئے وضو کر رہے تھے۔ التمش سلام کے بعد خود بھی وضو کرنے لگا۔ وضو کے بعد ان دونوں نے ایک ساتھ تہجد کی نماز ادا کی، اس کے بعد حجرے میں آ کر بیٹھ گئے تھے، تب حضرت کے پوچھنے پر التمش نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا۔

''جلال الدین نے مجھ سے پناہ اور امداد کی درخواست کی ہے۔'' التمش نے جواباً کہا تھا۔ ''اسے پناہ دینے کی صورت میں منگولوں کے حملے کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔''

''تمہارا اندازہ درست ہے۔'' چند لمحوں کے توقف کے بعد حضرت بختیارؒ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''مناسب یہی ہے کہ تم اسے امداد دینے کی بجائے، اس سے معذرت کر لو۔''

''بھلا کس طرح میں اس سے معذرت کروں؟'' التمش نے پریشان لہجے میں سوال کیا۔

''اسے کہلوا دو کہ یہاں کا موسم اور حالات اس کے موافق نہیں ہیں۔'' حضرت نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو بات اس کی سمجھ میں آ جائے گی۔''

حضرت کے جواب سے التمش کے دل کو خاصی تقویت ملی تھی۔ وہ پر سکون ہو کر قصر کی طرف روانہ ہو گیا تھا اور اسی دوپہر اس نے حضرت کے مشورے کے بموجب جلال الدین کو پیغام بھجوا دیا تھا۔

جلال الدین، التمش کے اشارے کو سمجھ گیا اور امداد و پناہ کی امید اٹھ جانے پر وہ سندھ اور مکران کے راستے سے ہوتا ہوا 1224ء میں ایران کی طرف چلا گیا، لیکن راستے میں اسے منگولوں کی بجائے موت نے آ گھیرا۔

اور یوں خوارزم شاہی سلطنت کی بربادی کے ساتھ ہی اس کا آخری فرمانروا خاکِ فنا میں جا ملا۔

☆......☆......☆

ناصر الدین قباچہ نے اپنی بیوی آمنہ کی بات مانتے ہوئے التمش سے معافی مانگ کر اس کی اطاعت قبول کر لی اور التمش نے بھی کمال مہربانی سے اسے ملتان، سندھ اور مغربی پنجاب کے علاقوں کی گورنری بخش دی تھی۔

پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ قباچہ نے دوبارہ پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے اور موقع پا کر سندھ کے ساتھ سیوستان پر بھی قبضہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ان دنوں التمش دہلی کے حالات بہتر کرنے میں مصروف تھا، اسی لئے قباچہ کی من مانیوں پر خاموش رہا۔

سلطنت کے حالات کسی قدر درست کر کے اس نے قباچہ کی طرف توجہ کی۔ خوارزمی اور منگول حملہ آوروں کی آمد و رفت سے قباچہ کو ازحد نقصان پہنچا تھا، خوارزمیوں نے اس کا بہت سا علاقہ اپنے تصرف میں لے لیا تھا، منگولوں نے ملتان پر لشکر کشی کر کے خوب لوٹ مار مچائی جبکہ جلال الدین کے بچے کھچے دستوں نے سیوستان میں خوب تباہی مچائی تھی، چنانچہ ان حالات میں قباچہ کی کمزوری اور پریشانی کو مدنظر رکھتے ہوئے سلطان، التمش نے اس پر حملہ کر دیا اور بھٹنڈا، کہرام اور سوسہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس کے پایۂ تخت اچ پر فوج کشی کی۔

قباچہ نے حالات کو بگڑتے دیکھ کر اپنے وزیر کو فوج دے کر قلعہ اچ میں چھوڑا اور خود خزانہ لے کر قلعہ بھکر میں چلا گیا۔

سلطان التمش نے قلعۂ اچ کا محاصرہ کر لیا۔ ایک مہینے کے محاصرے کے بعد آخر کار قلعہ اچ فتح ہوا۔

☆......☆......☆

بھکر کا قلعہ دریا کے بیچوں بیچ سر اٹھائے کھڑا تھا۔ رات کے سیاہ تاریک دامن نے قلعے کی اونچی فصیلوں کو چھپایا ہوا تھا۔ تیز ہوا کے جھکڑ قلعے کے وسیع احاطے میں یہاں سے وہاں سر پٹختے پھر رہے تھے، چاند اور تاروں سے محروم سیاہ تار آسمان ظلمتِ شب میں اضافے کا باعث تھا۔

ناصر الدین قباچہ اس وقت اپنی خواب گاہ میں بے چین و مضطرب ٹہل رہا تھا۔ اس کی پہلی بیوی کشمالہ کا بیٹا فخر الدین اور دوسری بیوی آمنہ کے بطن سے جنم لینے والے چاروں بیٹے اس کے ساتھ اسی قلعے میں موجود تھے۔ ہر دکھ سکھ، ہر ذلت، عزت میں ساتھ دینے والی نیک طینت اور وفادار بیوی آمنہ بانو بھی اس کے ہمراہ تھی، مگر اس وقت وہ



اپنی خواب گاہ میں بالکل تنہا تھا۔ کل ہی اسے خبر ملی تھی کہ سلطان التمش کے محاصرے کو مہینہ ہونے کو آیا ہے، اب وزیر باتدبیر کی ہمت جواب دے گئی ہے، قلعے کے اندر موجود اشیائے خورد و نوش کے ذخائر ختم ہو چکے ہیں اور اب یہ محاصرہ زیادہ عرصے تک روکا نہ جا سکے گا۔

اور ابھی کچھ دیر قبل اسے خبر ملی تھی کہ التمش نے قلعہ اُچ پر قبضہ کر لیا ہے۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا، امید کی آخری کرن بھی مایوسیوں کے اندھیرے میں گم ہو گئی تھی۔

ہمیشہ ہی اس کی آنکھوں نے ایک خود مختار ریاست کے خواب دیکھے تھے۔ آج وہ خواب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بکھر گیا تھا اور اس کے شکستہ خواب کی کرچیاں اس کی آنکھوں کو ہی نہیں، اس کی روح کو بھی زخمی کر گئی تھیں۔

اس نے دریا کی طرف کھلنے والا دریچہ کھول لیا تھا۔ دریچے کے کھلتے ہی دریا کی طرف سے سرد ہوا کا جھونکا کمرے میں در آیا تھا، ہوا میں ایک عجیب سی اداسی اور مایوسی رچی ہوئی تھی۔ قباچہ دریچے میں آ کھڑا ہوا، تاریک آسمان کے سائے میں سیاہ رات کی آغوش میں سوتا دریا کا پانی بھی کالا لگ رہا تھا، ہر شے تاریکی اور مایوسی میں ڈوبی ہوئی تھی، مایوسی کے انتہاء احساس نے اس کی دھڑکنوں کو کچھ اس طرح اپنے نکیلے پنجے میں جکڑا تھا کہ اسے سانس لینا بھی مشکل لگ رہا تھا، زندگی جیسے بے معنی اور بے مقصد ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر قلعے کے دائیں جانب گھاٹ کی طرف چل دیا۔ گھاٹ پر اس وقت ایک کشتی بندھی ہوئی تھی، وہ کشتی میں بیٹھ گیا اور اس کا بند کھول کر اسے دریا میں چھوڑ دیا۔ تاریک رات کے سیاہ آنچل میں سمٹی پرانی خستہ حال کشتی دریا کے تیز و تند لہروں پر ہچکولے کھاتی نامعلوم منزل کی جانب بڑھتی جا رہی تھی، تب ہی ایک تند لہر نے کشتی الٹ دی تھی اور ناصر الدین قباچہ لہروں میں ہاتھ پاؤں مارتا چند ہی لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا کچھ مورخین کا خیال ہے اس نے جان بوجھ کر خود کو دریا کے حوالے کیا۔ کچھ کا خیال ہے یہ خودکشی نہیں محض ایک حادثہ تھا۔ جو بھی تھا، بہر حال ناصر الدین قباچہ کا قصہ تمام ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

مہمات اور جنگ و جدال کا سلسلہ جاری تھا مگر اب التمش نے ملک کے اندرونی حالات سدھارنے کی طرف توجہ دی تھی۔

قطب الدین ایبک نے دہلی کی فتح کے بعد مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار کی تعمیر شروع کی تھی۔ اس کے زمانے میں قطب مینار کے صرف نیچے کے دو درجے تعمیر ہوئے تھے، بعد میں باقی ماندہ اوپر کے تمام درجے سلطان التمش نے تعمیر کروا کر اس مینار کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، نیز مسجد قوت الاسلام کے مزید تین دروازے تعمیر کروائے۔

ان دنوں دہلی کے کچھ علاقوں کو قلت آب کا سامنا تھا اور التمش اس مشکل کے حل کیلئے سوچوں میں گرفتار تھا کہ ایک شب جب وہ تہجد کی نماز کی ادائیگی کیلئے وضو کے خیال سے کنویں سے پانی نکال رہا تھا تو اس کی کنیز شمسی اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

"میں نے ابھی ابھی ایک خواب دیکھا ہے۔" اس نے نگاہ جھکا کر عرض کیا۔ "آپ اجازت دیں تو میں آپ کے گوش گزار کروں؟"

"بولو، ایسی کیا بات ہے؟" سلطان التمش نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ آپ کا لبادہ اٹھا کر مجھ پر ڈال رہے ہیں۔" شمسی نے خواب بیان کیا۔

التمش نے حضرت خواجہ بختیارؒ سے شمسی کے اس خواب کا تذکرہ کیا تو وہ دیر تک سوچ میں گم رہے پھر دھیمی آواز میں فرمایا۔ "سکندر منش! تم اپنی اس کنیز سے نکاح کر لو، اس خواب کی یہی تعبیر ہے۔"

اور سلطان التمش نے اسی شام شمسی سے عقد کر لیا۔ مہر عقد کے عوض شمسی نے ایک حوض کی تعمیر کی آرزو کی تھی۔

"میں خود بھی کافی عرصے سے اسی طرح کا ارادہ رکھتا ہوں۔" التمش نے اس کی آرزو پر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

سلطان التمش نے فوراً ہی تالاب کی تعمیر کا کام شروع کروا دیا اور اس تالاب کو "حوض شمسی" کا نام دیا گیا کیونکہ اس حوض کی تعمیر کنیز شمسی کے حق مہر کی رقم سے ہوئی تھی۔

سلطان شمس الدین التمش ایک مدبر، منتظم اور رحمدل بادشاہ تھا۔ اس کو ہر وقت عوام الناس کی بہبود کا خیال رہتا تھا، اس نے رعایا کو تعلیم کی سہولتیں پہنچانے کیلئے جگہ جگہ مدارس اور تعلیمی ادارے کھولے۔ اس نے ہمیشہ عالموں اور باکمال لوگوں کی حوصلہ افزائی کی، خصوصاً تاتاریوں کے ہاتھوں، اسلامی دنیا کے تہہ و بالا ہونے پر جب بخارا، غزنی، سمرقند اور نیشاپور وغیرہ سے ہزاروں علماء اور ہنرمند ہندوستان ہجرت کناں ہوئے تو سلطان نے سب کو ہاتھوں ہاتھ لیا، عالموں کے وضائف مقرر کئے اور دستکاروں کیلئے صنعتیں قائم کیں۔

وہ ہر وقت مظلوموں کی فریاد سننے کیلئے تیار رہتا تھا اور ان کی دادرسی میں کوئی فروگذاشت روا نہ رکھتا تھا اس کا حکم تھا کہ فریادی سیاہ لباس پہن کر آئیں تاکہ انہیں دور سے ہی پہچان لیا جائے اور ان کے دکھ و پریشانی کا علاج کیا جا سکے۔

جنگی مہمات اور حکومتی امور میں شب و روز مصروف ہونے کے باوجود وہ عبادت و ریاضت اور بچوں کی تعلیم و تربیت سے غافل نہ تھا، اب بچے بڑے ہو رہے تھے، وہ بڑے بیٹے ناصر الدین محمود اور بڑی بیٹی رضیہ سلطانہ سے حد درجہ محبت رکھتا تھا رضیہ سے چھوٹا رکن الدین فیروز، اپنی ماں شاہ ترخان کے مزاج کا تھا مگر حیرت انگیز بات تھی کہ سارے چھوٹے بھائی ناصر الدین کی بجائے رکن الدین سے الفت رکھتے تھے اور اس کی صحبت میں اسی کے سے انداز سیکھ کر بڑے ہو رہے تھے، البتہ چھوٹا شہزادہ قطب الدین، شمسی کے زیر نگرانی پرورش پا رہا تھا، وہ رکن الدین کی خامیوں سے دور تھا۔

سلطان التمش، ناصر الدین محمود اور رضیہ بیگم کی طرف سے خوش اور مطمئن تھا مگر وہ اپنے دوسرے بڑے بیٹے رکن الدین فیروز کو بھی درجۂ کمال پر دیکھنے کا خواہشمند تھا، اسے جب موقع ملتا، وہ اپنے تینوں بڑے بچوں کو اپنے پاس بٹھا کر ان سے باتیں کرتا اور اپنے علم و ہنر کے خزانے ان پر لٹاتا۔

☆......☆......☆

شہر پر رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، ستاروں کی مدھم روشنی میں گلیاں، مکان سب ہی بے چین نیند میں ڈوبے نظر آ رہے تھے۔

دن بھر کی محنت مشقت سے چور تھکے ہارے انسان گلیوں میں، صحنوں، کوٹھوں اور راہ گزاروں میں بان کی چارپائیوں پر سو رہے تھے، اکا دکا اس وقت بھی خوش گپیاں کرتے ہوئے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے تھے، کسی کسی کے ہاتھ میں موتیا کے گجرے تھے، پھولوں کی مہک کچھ اور فضا کو معطر کرتی، پھر گرمی کی حدت میں کھو جاتی۔ کتے نالیاں سونگھتے پھر رہے تھے، بلیاں دکانوں کے تختوں کے نیچے سے دبے پاؤں باہر نکلتیں اور دودھ کے ان جھوٹے آبخوروں کو چاٹنے لگتیں جو دودھ پینے کے بعد لوگ پھینک گئے تھے۔ ایک آدھ دودھ والے کی دکان اب بھی کھلی تھی، کوئی آتا اور پیسے دو پیسے کا دودھ پیتا اور آبخورہ نیچے پھینک دیتا، بلیاں کونے کھدروں سے نکل کر آبخورے کو چاٹنے لگتیں۔

گلیوں میں گھر خاموش کھڑے گزرتی رات کی چاپ سن رہے تھے۔ ایسے میں ایک نیم پختہ گھر کے نیم وا دروازے سے نکلی کسی لڑکی کی سسکی ابھری اور گلی سے گزرتا گدڑی پوش، لمبے قد کا فقیر ہاتھ میں تھامی لاٹھی کو زمین پر ٹیک کر فوراً رک گیا۔

دروازے کے اوٹ سے پھر سسکی ابھری تھی۔ اس کے بعد تسلسل اور تواتر سے سسکیاں اور ہچکیاں سنائی دینے لگی تھیں۔ گدڑی پوش فقیر دو قدم چل کر دروازے کے قریب پہنچا۔

"اے دختر! تو کون ہے؟ اور اس عالم شب میں اس طرح یک و تنہا کیوں رو رہی ہے؟" فقیر کی بھاری اور باوقار آواز میں نرمی اور ہمدردی تھی۔

"آپ کو کیا بتاؤں بابا! اپنے نصیب کو روتی ہوں۔" نوجوان لڑکی نے ٹاٹ کے پردے کے اوٹ میں خود کو چھپاتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

"مناسب سمجھو تو، تم اپنے غم میں مجھے شریک کر سکتی ہو، شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔" گدڑی پوش فقیر نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔

"آپ تو کیا کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکتا۔" لڑکی نے مایوس اور حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "مگر دل کے بوجھ کو کم کرنے کے خیال سے آپ سے کہہ دیتی ہوں...... کچھ عرصے قبل ایک میلے میں مجھے ایک انتہائی خوبرو جوان رعنا لڑکا ملا تھا، وہ بھی میرے حسن و دلکشی سے متاثر ہوا تھا، سو وہ میرے پیچھے میرے گھر تک چلا آیا۔ میرے گھر میں سوائے ایک بوڑھی نانی کے اور کوئی نہیں تھا، میں نے اس لڑکے سے کہا، مجھے چاہتے ہو تو نکاح کر لو، میں گناہ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی، وہ اپنے لباس سے کسی اعلیٰ خاندان کا فرد لگتا تھا، بولا میں اپنے اہل خانہ سے چھپا کر تجھ سے نکاح کر سکتا ہوں، سو میں راضی ہو گئی، وہ اکثر میرے پاس آنے لگا اور اب جبکہ میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں تو وہ مجھے اور نہ ہی اس بچے کو اپنا ماننے پر تیار ہے، ہفتوں سے اس طرف کا رخ نہیں کیا، اب آپ ہی بتایئے میں اس بچے کو لے کر کہاں جاؤں، دنیا کا کس منہ سے سامنا کروں...... روز سر شام اس دروازے میں ٹھہر کر اس کی راہ دیکھتی ہوں، جوں جوں رات بھیگتی جاتی ہے، میری پلکیں بھی بھیگتی جاتی ہیں، کبھی جذبات سے بے قابو ہو کر میں ہچکیوں اور سسکیوں سے بھی رونے لگتی ہوں، جیسا کہ آج ہوا...... اور آپ راہ چلتے چلتے رک گئے۔"

"کیا تم نے خود سے اسے تلاش کرنے اور اس کے گھر جانے کی کوشش نہیں کی؟" گدڑی پوش فقیر نے سوال کیا۔

"کوشش کی تو پتہ چلا وہ تو شاہی خاندان کا فرد ہے۔" لڑکی کے جواب پر فقیر نے چونک کر پوچھا۔ "شاہی خاندان کا فرد......! کیا نام ہے اس کا......؟"

"رکن الدین فیروز۔" لڑکی نے بے ساختہ نام لیا پھر دانتوں تلے ہونٹ دبا لیے۔

"دیکھئے کسی کے سامنے یہ نام نہ لیجئے گا...... ورنہ ان کی بدنامی ہوگی۔"

"اور تم کو اپنی بدنامی کی فکر نہیں ہے؟" فقیر نے قدرے غصیلے لہجے میں کہا۔ "تمہیں تو رکن الدین کے باپ کے پاس جانا چاہئے تھا۔"

"میں گئی تھی، مگر شاہی قصر کے اونچے در و دیوار کے اس پار جانے کا رستہ نہ پا سکی...... شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ سلطان وقت تک فریاد پہنچانا کتنا مشکل کام ہے۔" گدڑی پوش فقیر سر جھکائے چند لمحوں تک اس کی بات پر غور کرتا رہا پھر آہستگی سے واپسی کے لئے پلٹ گیا۔

یہ گدڑی پوش فقیر دہلی کا سلطان شمس الدین التمش تھا۔ جسے بھیس بدل کر رعایا کا حال جاننے کا شوق تھا اور آج اسے اپنے ہی بیٹے کے کرتوت کا علم ہوا تھا۔

گھر پہنچتے ہی اس نے شاہ ترخان کو طلب کیا اور تمام حال بیان کیا۔

"آپ اپنی ہی مصروفیات میں مگن رہتے ہیں۔" شاہ ترخان نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اس پر توجہ دیتے ہیں اور نا ہی کوئی ذمے داری سونپتے ہیں تو اس عمر میں لڑکے یہ سب نہیں کریں گے تو کیا کریں گے؟"

"ٹھیک ہے، میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں۔" التمش نے جواب دیا۔ "اور تم اس لڑکی کو جو اس کی منکوحہ ہے، گھر لانے کی تدبیر کرو۔"

چنانچہ اس واقعے کے بعد اس نے اپنے محل کے باہر برجوں میں سنگ مرمر کے دو شیر بنوا کے رکھوا دیے، ان کے گلوں میں لوہے کی چھوٹی زنجیر ڈال کر گھنٹیاں لگوا دیں اور حکم ہوا کہ کوئی مظلوم کسی وقت بھی آ کر ان گھنٹیوں کو بجا سکتا ہے۔ سلطان ان کی آواز سن کر باہر آ جاتا اور مظلوموں کی دادرسی کرتا۔

اگلے ہی دن سلطان نے اپنے بڑے بیٹے ناصر الدین محمود کو لکھنوتی اور چھوٹے بیٹے رکن الدین فیروز کو بدایوں اور گوالیار کا علاقہ سونپ کر انہیں روانہ کر دیا۔ ناصر الدین محمود پر وہ بھرپور یقین رکھتا تھا، مگر رکن الدین فیروز کی طرف سے وہ زیادہ پرامید نہ تھا، لیکن اس کی ماں شاہ ترخان سے وعدے کے بموجب اسے رکن الدین کو ذمہ داریاں تو بہرحال سونپنی ہی تھیں۔

جب تک سلطان التمش کو بیرونی خطرات سے نجات نہ ملی اس نے کسی بڑی مہم کا ارادہ نہ کیا لیکن منگولوں کے چلے جانے اور قباچہ کے ختم ہو جانے پر اس نے 1224ء میں بنگال کی طرف توجہ کی۔ بنگال میں علی مردان نے بے حد ظلم برپا کر رکھا تھا جس کی تلافی اسے اپنے خون سے کرنی پڑی۔ اس کے افسروں نے اسے قتل کر کے اس کی جگہ غیاث الدین عوض کو منتخب کر لیا تھا۔

عوض نے عنان حکومت سنبھالتے ہی خود مختارانہ رویہ اختیار کیا اور بہار کو بھی اپنے دائرۂ اقتدار میں شامل کر لیا۔

اس کی سرکشی اب ناقابل برداشت تھی۔ سو التمش ایک بڑی فوج لے کر بنگال کی طرف روانہ ہوا، پٹ گاؤں کے میدان میں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں اور حسب توقع غیاث الدین عوض کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ جان بچا کر ایک بنگالی غلام کے گھر جا پوشیدہ ہوا، پھر وہاں سے گرفتار ہو کر التمش کے حضور پیش کیا گیا۔ وہ معافی کا خواستگار ہوا اور اطاعت کی یقین دہانی کروائی۔

شمس الدین التمش، عوض سے اقرار اطاعت اور تیس ہاتھی بطور نذرانہ لے کر وہاں اپنے بیٹے ناصر الدین محمود کو بہار اور بنگال کا ناظم مقرر کر کے خود دہلی کی طرف واپس لوٹ گیا۔

شمس الدین التمش کے چلے جانے کے بعد عوض نے پھر سرکشی اختیار کی۔ اس پر ناصر الدین محمود نے باپ سے اس کی سرکوبی کی اجازت چاہی اور التمش کی طرف سے اس فتنے کو مٹانے کا حکم پا کر ایک بہت ہی غضبناک طریقے سے عوض پر حملہ آور ہوا۔ گھمسان کا رن پڑا اور کئی روز تک یہ جنگ جاری رہی۔ آخر کار عوض اس لڑائی میں مارا گیا، اس کی موت کے بعد اس کے غصب شدہ علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا گیا اور اس طرح بنگال براہ راست التمش کے ماتحت ہو جانے سے سلطنت دہلی میں شامل کر لیا گیا۔

پرتھوی راج کی شکست سے رنتھمبور کا مضبوط قلعہ مسلمانوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ لیکن قطب الدین کی وفات کے بعد راجپوتوں نے وہ قلعہ واپس حاصل کر لیا تھا۔ التمش اس قلعے کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا، چنانچہ بنگال اور بہار کی مہم جوئی سے فراغت پاتے ہی وہ 1926ء میں رنتھمبور پر حملہ آور ہوا اور ایک طویل محاصرے کے بعد اسلامی پرچم دوبارہ رنتھمبور پر لہرانے لگا، اس کے بعد اس نے فوج کشی کر کے مینڈور پر بھی قبضہ کر لیا۔

☆......☆......☆

بنگال کی مشرقی پہاڑیوں کے ساتھ دور تک پھیلا ہوا گھنا جنگل اس وقت شب دیجور کی آغوش میں سمٹا سو رہا تھا۔ گھنے اور سیاہ بادلوں کے باعث رات کی سیاہی کچھ اور گہری ہو گئی تھی، ہر چیز گہری تاریکی کے غبار میں لپٹی ہوئی تھی، وقفے وقفے سے ہوتی تیز بارش میں دھلے دھلائے سرسبز و شاداب گھنے پیڑ اس گاڑھے اندھیرے کا حصہ معلوم ہو رہے تھے۔ کبھی جو یکلخت بجلی کڑکتی تو ہر شے تیز روشنی میں نہا جاتی، پھر چشم زدن میں گہری تاریکی اس جھماکے کو نگل لیتی اور ہر شے حسب سابق تاریکی کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتی۔

تیز ہوا کے پرشور جھکڑوں میں جب بادلوں کی گھن گرج شامل ہوتی تو ہر سمت ایک عجب خوفناک اور بھیانک حصار سا تن جاتا۔

چھوٹی بڑی خاکستری پہاڑیوں اور گھنے جنگل کے اس پار واقع چھوٹے سے قصبے روپ نگر کے مکھیا کرشن چندر کی چھوٹی سی حویلی کی ایک اندرونی کوٹھری میں اس وقت ایک 19,18 برس کی گداز اور سڈول جسم کی سانولی سلونی لڑکی اپنے سامنے الاؤ جلائے کسی جاپ میں مصروف تھی۔ اس وقت اس کی بڑی بڑی سیاہ سحر انگیز آنکھیں بند تھیں اور سانولے دلکش و پرکشش چہرے پر ایک سکوت سا طاری تھا۔ وہ آلتی پالتی مارے ساکت بیٹھی اپنے باپ کی لمبی عمر اور کامیابی کیلئے دیوتا کی پوجا پاٹھ کے ساتھ جاپ میں مصروف تھی۔

حویلی کے چاروں اور بے تھے بیلوں اور پاگل سانڈوں کی طرح ڈکراتے پھرتے ہوا کے تیز جھکڑ، آسمان پر رہ رہ کر کڑکتی بجلی اور ہیبت ناک انداز میں گرجتے بادل...... یہ تمام شور شرابہ اس کمرے کے بند دریچوں کے باہر ہی تھا، اندر مکمل خاموشی اور روح میں اترتا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

تب ہی گاؤں کا بوڑھا اور لاغر مکھیا کرشن چندر دروازہ کھول کے لڑکھڑاتے قدموں سے کوٹھری میں داخل ہوا۔

"بجھا دے یہ آگ اور توڑ دے یہ جاپ۔" اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جس کی لمبی عمر اور کامیابی کے لئے تو یہ سب جتن کر رہی ہے، وہ اب اس سنسار میں نہیں رہا۔"

لڑکی نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں اور سوالیہ نظروں سے بوڑھے کی طرف دیکھا تھا۔ "ابھی ابھی خبر آئی ہے، تیرا باپ غیاث الدین عوض، التمش کے بیٹے ناصر الدین محمود کے ہاتھوں مارا گیا...... رسونتی، میری بچی! تو اناتھ ہو گئی۔"

"کیا کہہ رہے ہو نانا......؟" لمحہ بھر کو اس کی بڑی بڑی جادو بھری آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی لرزی تھی، پھر حیرت کی جگہ نفرت، غصہ اور طیش نے لے لی۔ "اگر یہ خبر سچ ہے تو سمجھو التمش کے اس بیٹے کو جس نے میرے پتا کا خون کیا ہے، میرے ہاتھوں سے کوئی بچا نہ پائے گا۔" اس نے نفرت بھری آواز میں کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

غیاث الدین عوض ایک بار اس گھنے جنگل میں شکار کھیلنے آیا تھا، تب ہی اس کی نظر گاؤں کے مکھیا کرشن چندر کی اکلوتی اور چہیتی بیٹی نندنی پر پڑی تھی اور وہ اس پر دل و جان سے فدا ہو گیا تھا اور بمشکل آخر کار اس کے باپ کو منا کر اس سے بیاہ رچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

شادی کے بعد وہ نندنی کو اپنی جاگیر پر لے گیا تھا، وہیں سال بھر بعد رسونتی پیدا ہوئی تھی۔ رسونتی عوض کی اکلوتی اولاد تھی اور اسے بے حد عزیز تھی، اس نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم اور شاہانہ طریقے سے کی تھی، اسے علم و ادب کے ساتھ تیغ زنی اور تلوار بازی کی بھی تعلیم دی تھی، وہ بہترین گھڑ سوار اور نیزے باز تھی۔

ابھی وہ صرف تیرہ برس کی تھی کہ نندنی سیڑھیوں سے پھسل کر حادثاتی طور پر موت کے منہ میں چلی گئی۔ یہ وہ دور تھا جب علی مردان اور اس کے افسران کے مابین چپقلش چل رہی تھی اور اس آگ کو بڑھاوا دینے میں غیاث الدین عوض پیش پیش تھا۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے رسونتی کے نانا کرشن چندر نے مناسب یہی سمجھا کہ وہ اپنی نواسی بن ماں کی بچی کو اپنے پاس لے جا کر رکھے۔ عوض اس بات کے لئے آمادہ نہ تھا، وہ بیٹی کو بے حد چاہتا تھا۔ خود رسونتی باپ کی صورت دیکھ کر جیتی تھی۔ حالات کی نزاکت کو دیکھ کر اس نے اسے اس کے نانا کے ساتھ بھیج دیا تھا مگر خود پابندی کے ساتھ بیٹی سے ملنے آتا تھا۔ اس وقتی جدائی نے محبت کی آگ کو اور تیز کر دیا تھا۔ باپ بیٹی ایک دوسرے کو پہلے سے زیادہ چاہنے لگے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کئی برس بیت گئے۔ اب بنگال اور بہار پر عوض کی حکومت تھی، اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ مگر اس کی حکومت دیرپا ثابت نہ ہوئی اور ناصر الدین محمود نے اپنے باپ سلطان شمس الدین التمش سے اجازت لے کر غیاث الدین عوض کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

اس حال میں رسونتی اپنے پتا کی کامیابی اور زندگی کیلئے لمحہ لمحہ دعا گو تھی، وہ رات دن باپ کی لمبی عمر کے لئے بھگوان سے پرارتھنا کرتی رہتی تھی، لیکن اس کی ساری پرارتھنائیں، ساری تپسیائیں اکارت چلی گئی تھیں اور ناصر الدین محمود کی خون آشام تلوار اس کے چاہنے والے پتا کا خون چاٹ گئی تھی۔

اس نے اسی وقت دو دھاری خنجر اٹھا کر سوگند کھائی تھی کہ جب تک وہ اپنے باپ کے قاتل کے سینے میں یہ خنجر نہ اتار دے گی، چین سے نہ بیٹھے گی۔

☆......☆......☆

حبس کے گہرے احساس نے سارے ماحول کو اپنے نوکیلے پنجوں میں جکڑا ہوا تھا، نیلے آکاش پر سرمئی اودے بادل گھر گھر کر آنے شروع ہوئے تھے، گھڑی بھر کو کھل کر بارش ہو جاتی تو حبس اور گھٹن کا زور ٹوٹ جاتا۔ گو ہوا چل رہی تھی مگر لگتا تھا جسموں کو چھوئے بغیر ہی گزر جاتی ہے۔ جوں جوں رات بھیگتی جا رہی تھی حبس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ناصر الدین محمود کی خواب گاہ کے سارے دریچے دیدۂ حیران کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ ہر کمرہ تازہ ہوا کے وجود سے محروم تھا۔ بستر پر کافی دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد ابھی ابھی اس کی آنکھ لگی تھی۔

تب ہی دریچے پر دو ہاتھ نمودار ہوئے تھے۔ دانتوں میں چمکتا خنجر دبائے، ایک سیاہ پوش سایہ چوکھٹ پکڑ کر اچھل کر آہستگی کے ساتھ خواب گاہ میں در آیا تھا۔ چھت سے لٹکتے فانوس میں ٹمٹماتی کافوری شمعیں آخری دموں پر تھیں، اسی لئے کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

آنے والا چند لمحوں تک اپنی جگہ پر ساکت رہ کر تیز نظروں سے خواب گاہ کا جائزہ لیتا رہا۔ دروازے سے باہر دو خدام دیوار سے لگے بیٹھے اونگھ رہے تھے اور سامنے حریری بستر پر سلطان ہند کا چہیتا اور پہلوٹھی کا بیٹا ناصر الدین محمود نیند کی وادی میں کھویا ہوا تھا۔

آنے والے نے خنجر ہاتھ میں پکڑا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اچھل کر محمود کے بستر کی طرف بڑھا۔ اس پر قدرے جھک کر اس نے جوں ہی خنجر کا وار کیا، محمود نے یک لخت کروٹ بدل لی، خنجر اس کے سینے میں پیوست ہونے کی بجائے نرم بستر میں دھنس گیا تھا اور خنجر والا محمود پر گر گیا۔

محمود نے ایک دم آنکھیں کھول کر اس کی کلائی تھام کر بستر پر گرا دیا اور اگلے ہی لمحے بستر میں گڑا خنجر نکال کر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

بستر پر گرتے سے اس کے سر پر بندھی پگڑی دور جا گری تھی اور اس وقت اس کے گھنے سیاہ دراز ریشمی گیسو تکیے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کی بڑی بڑی سحر انگیز آنکھوں میں اس وقت غزالوں کی سی وحشت تھی۔

ناصر الدین محمود اپنی خواب ناک آنکھوں میں حیرت لئے اس حسین آنکھوں والی دلکش لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

"تم کون ہو......؟ اور یہاں اس طرح مردانہ لباس میں مجھے قتل کرنے کیوں آئی تھیں؟"

"تمہیں ان سب باتوں سے کچھ غرض نہیں ہونا چاہئے۔" رسونتی نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔ "خنجر تمہارے ہاتھ میں ہے، اسے میرے سینے میں اتار کر میرے گناہ کی سزا دے دو۔"

رسونتی کے بے خوف لہجے نے محمود کو حیران کرنے کے ساتھ متاثر بھی کیا تھا۔ وہ بہادر باپ کا بہادر بیٹا تھا اور بہادروں کی قدر کرتا تھا۔ وہ خنجر ہاتھ میں تھامے اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہتے دشمن پر ہتھیار اٹھانا ہمارا شیوہ نہیں۔" وہ سامنے کی جانب جا کر رخ موڑتے ہوئے بولا۔ "اور عورتوں پر ہاتھ اٹھانا...... مردانگی کے منافی ہے...... اس لئے تم جو بھی ہو، جہاں سے آئی ہو...... واپس جا سکتی ہو۔"

دروازے پر ایستادہ نیزہ بردار خدام چوکنا ہو چکے تھے۔ رسونتی بستر سے اٹھ کر محمود کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی اور وحشت زدہ نظروں سے کبھی محمود اور کبھی دروازے پر موجود خدام کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ناصر الدین محمود نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا، مردانہ بے ڈھب لباس میں بھی اس کی دلکشی قیامت ڈھا رہی تھی۔

"لیکن اگر جانے سے قبل تم یہ بتا دو کہ آخر میرا ایسا کیا جرم ہے کہ جس کی پاداش میں تم مجھے قتل کرنے رات کی اس تاریکی میں میری خواب گاہ تک آ پہنچیں تو میرے دل کو سکون ملے گا۔"

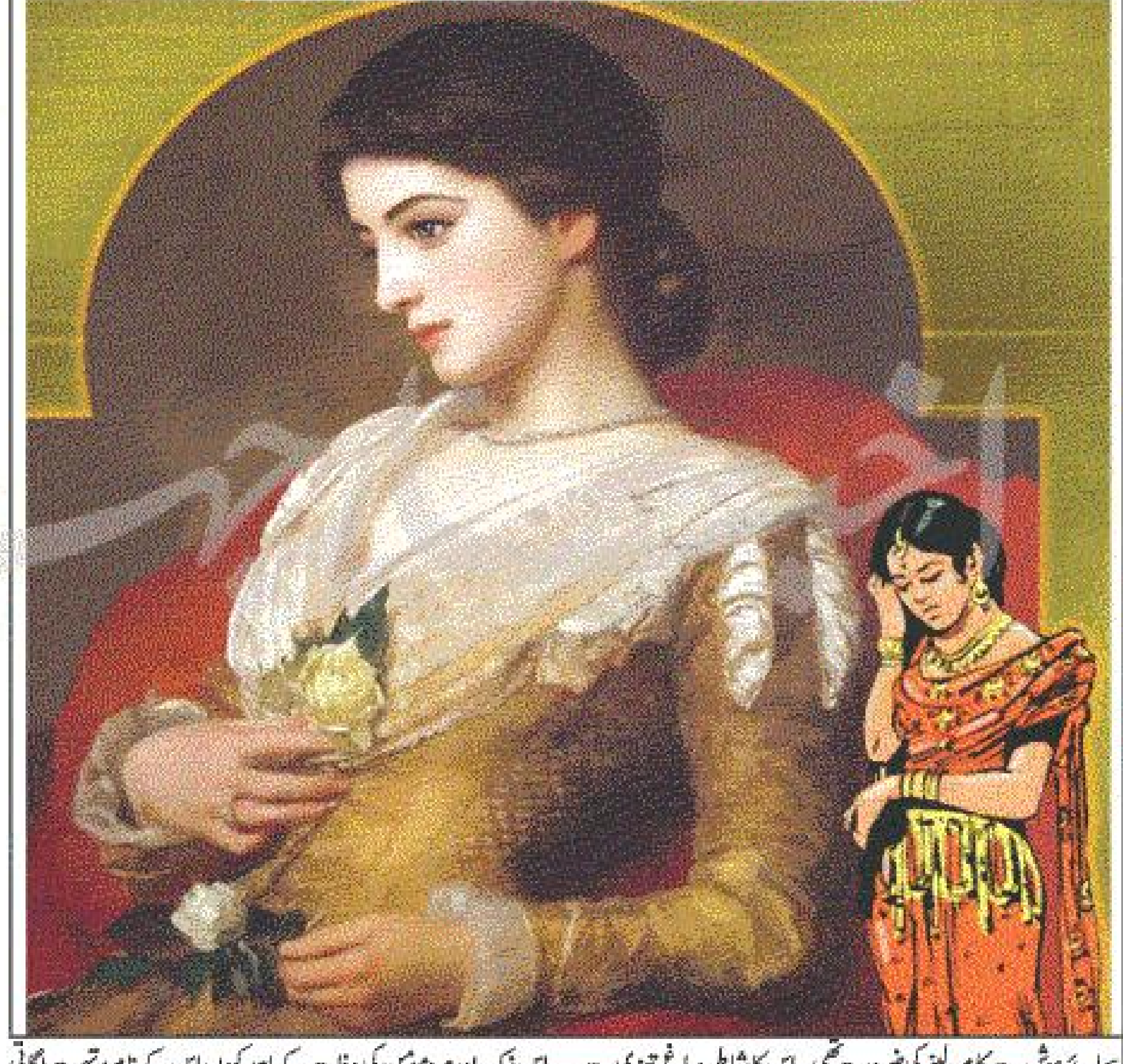
"میں غیاث الدین عوض کی ہندو پتنی کی بیٹی رسونتی ہوں۔" رسونتی نے فخریہ انداز میں سر اونچا کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے میرے باپ کو قتل کر کے اس کا علاقہ اس سے چھین لیا، میں نے اس خنجر کو ہاتھ میں لے کر قسم کھائی تھی کہ جب تک یہ خنجر تمہارے سینے میں نہ اتار دوں گی، چین سے نہ بیٹھوں گی۔"

رسونتی نے محمود کے ہاتھ میں موجود اپنے خنجر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوری سچائی کے ساتھ ساری بات اس کے گوش گزار کر دی۔

"تمہارا باپ ملک ...ہوس گیری میں جنگ میں مارا گیا، اگر میں چوک جاتا تو وہ مجھے قتل کر دیتا، میدان جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے، البتہ اگر تم سمجھتی ہو کہ میں نے غلط کیا تو یہ خنجر تمہارے ہاتھ میں ہے۔" محمود نے خنجر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "اور میرا سینہ تمہارے سامنے ہے، تم یہ خنجر میرے سینے میں گھونپ کر اپنے انتقام کی آگ کو بجھا سکتی ہو۔"

(جاری ہے)

رونق نے خنجر تھام لیا۔ اس کے سامنے وہ شخص سینہ کشادہ کئے کھڑا تھا جو اس کے نزدیک اس کے باپ کا قاتل تھا، جس سے وہ شدید نفرت کرتی تھی۔ اس وقت اس کا پورا وجود انتقام کی آگ میں سلگ رہا تھا، مگر وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے شہزادے پر وار کیا تو دروازے پر ایستادہ خدام اسے لمحوں میں موت کے گھاٹ اتار دیں گے، اس لئے اسے جوش کی



بجائے ہوش سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ اس کا شاطر دماغ تیزی سے متحرک تھا اور جلد ہی اس نے ایک تیر بہدف نسخہ تجویز کر لیا۔

اچانک اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سلطان زادے کے قدموں میں جا گرا، وہ بے ساختہ ناصر الدین محمود کے قدموں میں جھک گئی اور سسکتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''شہزادے! میں آپ کو قتل نہیں کر سکتی مگر اب خود بھی زندہ نہیں رہ سکتی، میرا باپ اس بھری دنیا میں میرا واحد سہارا تھا...... اب وہ دنیا میں نہیں رہا تو میرا بھی اس دنیا میں رہنے کا جواز جاتا رہا...... بھلا میں کس کے سہارے جیوؤں گی...... اکیلے کیونکر جیون بتاؤں گی...... اس لئے آپ سے میری بنتی ہے...... یہ خنجر اٹھا کر میرے سینے میں اتار دیجئے یا دروازے پر موجود خدام کو حکم دیجئے کہ وہ میری زندگی ختم کر دیں، اب میں جینا نہیں چاہتی۔''

ناصر الدین محمود نے رحم بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ناصر الدین محمود ہو بہو اپنے عظیم باپ شمس الدین التمش کی تصویر تھا، اسی کی طرح اونچا، لمبا، حسین و جمیل اور شاندار و باوقار......

''اگر تم پسند کرو تو تم اس محل میں رہ سکتی ہو۔'' چند لمحوں تک گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد محمود نے دھیمے مگر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''لونڈی کی حیثیت سے یا مالکہ کی حیثیت سے......؟'' رونق نے بے ساختہ سوال کیا۔

ناصر الدین محمود نے نگاہ جھکا کر لحظہ بھر کو سوچا پھر مضبوط لہجے میں بولا۔ ''جو تم پسند کرو...... لیکن عقد کے لئے تمہارا پوری طرح اسلام قبول کرنا ضروری ہو گا گو کہ تم مسلمان باپ کی بیٹی ہو مگر نام اور انداز سے ہندو مت کی پیروکار لگتی ہو، اس لئے لازم ہو گا کہ تم پوری طرح دین اسلام میں داخل ہو جاؤ۔''

''مجھے منظور ہے۔'' رونق نے لرزتے لہجے میں جواب دیا۔

ناصر الدین محمود نے رونق کو قبول اسلام کے ساتھ اسلامی نام دے کر اپنے عقد میں لے لیا مگر رونق نے دل سے اسلام کو قبول کیا تھا، نہ اپنے نئے نام کو اور نہ ہی اس رشتے کو...... وہ ناصر الدین محمود کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے اس کی ہنستی بستی میں داخل ہو گئی تھی۔ وہ اپنے سامان کے ساتھ ایک آہستہ اثر زہر کی شیشی لے کر آئی تھی۔

☆......☆......☆

التمش کے زمانے تک بغداد کے عباسی خلیفہ کے اختیارات بہت محدود ہو گئے تھے لیکن اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے اس کو اب بھی دنیائے اسلام میں بہت بلند درجہ حاصل تھا۔ عام طور پر ان کی تائید اور اجازت کے بغیر کسی اسلامی حکومت کو از روئے آئین خلافت جائز تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، چنانچہ التمش کی درخواست پر بغداد کے عباسی خلیفہ نے اس کے پاس بیش بہا تحائف اور سند حکومت روانہ کی، جس کو حاصل کر کے التمش کو قانونی طور پر ہندوستان پر حکومت کرنے کی اجازت مل گئی، چنانچہ سلطنت دہلی اب مکمل طور پر غزنی و غور کے اثر سے الگ ہو گئی۔

ابھی التمش خوشی کے ان لمحوں سے پوری طرح محظوظ بھی نہ ہو پایا تھا کہ ایک انتہائی اندوہناک خبر نے اس کے پیروں تلے سے زمین نکال دی۔ یہ خبر اس کے چہیتے بیٹے ولی عہد ہند ناصر الدین محمود کی موت کی خبر تھی۔

رونق کے آہستہ اثر سم قاتل نے بالآخر اثر دکھا دیا تھا اور رفتہ رفتہ کمزور و لاغر ہو کر ناصر الدین محمود محض 19 برس کی عمر میں ابدی نیند سو گیا تھا۔

التمش کو اپنا یہ بیٹا بے حد عزیز تھا۔ ناصر الدین محمود کی لیاقت و قابلیت پر اسے بے حد اعتبار تھا، اسی لئے اس نے اسے اپنا جانشین منتخب کیا تھا مگر اس نے تو چند قدم چل کر ہی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

التمش کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ ایسے میں اس کی نوجوان بیٹی رضیہ بیگم نے اس کا بے حد ساتھ دیا، وہ لمحہ لمحہ باپ کے غم و اندوہ میں شریک تھی......

رب رحیم نے اس نقصان کی تلافی کے لئے شمسی کو ایک چاند سا بیٹا عطا کیا۔ التمش نے اس کا نام ناصر الدین محمود رکھا۔ ننھے محمود کی آمد سے اس کے بے تاب و بے کل دل کو کسی قدر سکون ملا۔

ناصر الدین محمود کے انتقال سے فائدہ اٹھا کر ایک خلجی سردار ملک خلجی نے بغاوت کر دی۔ التمش ایک لشکر جرار لے کر بنگال و بہار کی طرف روانہ ہوا اور ملک خلجی کو شکست دے کر تہہ تیغ کیا اور اس علاقے کا حاکم علاؤ الدین کو مقرر کیا۔ بنگال و بہار کے دوبارہ قبضے میں آنے کے بعد اس نے ان علاقوں کو الگ الگ صوبوں میں منقسم کر دیا، اس طرف سے فراغت پا کر اس نے اپنے مسائل کی طرف توجہ کی۔

رکن الدین فیروز کو اس نے بدایوں اور پھر لاہور کی گورنری سپرد کی تھی۔ لیکن اس کا یہ تجربہ ناکام ثابت ہوا۔ فیروز میں انتظام و انصرام اور حکومت کی صلاحیت کا فقدان تھا، شمسی کا بیٹا ناصر الدین محمود دوم اور ماہ نور بانو کا چھوٹا بیٹا قطب الدین ابھی خاصے کم عمر تھے، بقیہ بڑے بیٹوں میں سے بھی کسی میں سلطنت کے امور سنبھالنے کی صلاحیت نہ تھی، اپنے بیٹوں کی کم لیاقتی کے باعث اپنے خاندان کے مستقبل کے متعلق اسے بے حد فکر تھی۔

اس شام التمش اپنی ذہین و قابل بیٹی رضیہ بیگم اور چھوٹے بیٹے قطب الدین کے ساتھ پائیں باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا، تب ہی ایک غلام سر جھکائے باغ میں داخل ہوا اور مودبانہ لہجے میں گویا ہوا۔ ''میں سلطان معظم کی چہل قدمی کے دوران مخل ہونے پر معافی کا خواستگار ہوں مگر مسئلہ ایسا تھا کہ سلطان معظم کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری تھا۔''

''مقصد بیان کر۔'' سلطان التمش نے اس کی تمہید سے اکتا کر قدرے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

''قصر کے دروازے پر ایک لڑکی موجود ہے، وہ اپنا نام رونق بتاتی ہے اور خود کو مرحوم شہزادے کی منکوحہ کہتی ہے، وہ آپ سے ملنے کے لئے مصر و بضد ہے۔''

غلام کے جواب پر سلطان التمش اور رضیہ بیگم نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''رونق نام کی لڑکی اور ناصر الدین کی منکوحہ......؟'' سلطان نے حیران لہجے میں کہا۔ ''خیر تم اسے یہاں بھیج دو۔''

کچھ ہی دیر میں ایک سیاہ چادر میں لپٹی رونق، سلطان کے سامنے حاضر ہو گئی۔

''تو کون ہے؟'' سلطان نے اس کی سمت دیکھے بنا سوال کیا۔ ''اور

اس نیک اور مرد مومن کی وفات کے بعد کیوں اس کے نام پر تہمت لگاتی ہے؟''

''تہمت لگانا تو بہت معمولی جرم تھا۔'' رونق کی سسکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''میں تو اس سے بھی بڑا جرم کر چکی ہوں اور اب وہ گناہ میرے ضمیر کا بوجھ بن گیا ہے...... مجھے رات دن کچوکے لگاتا ہے، میں آٹھوں پہر بن جل مچھلی کی طرح تڑپتی ہوں...... آخر ضمیر کی خلش اور دل کی تڑپ سے مجبور ہو کر آپ کے حضور حاضر ہو گئی ہوں، میری تمام بات سن کر مجھ بدنصیب عورت کے لئے سزا تجویز کر دیجئے تاکہ دل کا یہ بوجھ کم ہو۔''

رونق نے بھیگے لہجے میں جواب دیا اور سلطان کی اجازت پا کر شروع سے آخر تک سب کہانی کہہ سنائی۔

رونق کی کہانی ختم ہو چکی تھی اور ساتھ ہی رضیہ اور سلطان التمش کے دل کی دھڑکنیں بھی مدھم پڑ گئی تھیں۔

التمش کی آنکھیں ضبط گریہ سے سرخ ہوتی جا رہی تھیں اور چہرہ ملال کے گہرے سایوں میں گم ہو گیا تھا۔ جس لخت جگر کی موت نے اسے زندہ درگور کر دیا تھا، آج اسی کی قاتلہ اس کی بیوہ کے روپ میں اس کے سامنے موجود تھی۔

''مجھے انتقام نے اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ میں ان کی سچی محبت کو بھی نہ سمجھ سکی اور اب انہیں کھو کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنے جیون کی ہر خوشی کھو دی ہے۔''

پھر رونق، سلطان کے قدموں میں جھک گئی۔ ''سلطان معظم! اب میرے زندہ رہنے کی کوئی صورت ہے اور نہ ہی میں زندہ رہنے کی آرزومند ہوں، ضمیر کی خلش میری روح میں کچوکے لگا رہی ہے...... میں پل پل مرتی ہوں، پر مر نہیں سکتی...... آپ سے گزارش ہے کہ آپ مجھے قتل کروا کر اس لمحے لمحے کی موت سے نجات دے دیجئے۔''

التمش کچھ دیر تک زمین پر نظریں گاڑھے پر جلال انداز میں کچھ سوچتا رہا پھر کلمہ طیبہ پڑھتا ہوا آگے کی سمت روانہ ہو گیا تھا۔ رضیہ اور قطب الدین اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔

''سلطان! میرا فیصلہ کئے بغیر مت جائیے۔'' رونق گڑگڑاتی ہوئی اس کے پیچھے دوڑی۔ ''میری گردن اڑوا دیجئے یا مجھے سولی پر لٹکا دیجئے...... مگر مجھے اس حال میں تڑپتا چھوڑ کر مت جائیے۔'' وہ دوڑ کے اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

سلطان نے خود کو اس کی گرفت سے دور کیا اور انتہائی ضبط بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''تو نہیں جانتی کہ تو نے مجھے بندہ مجبور و عاجز کو کیسے صدمہ عظیم سے دوچار کیا ہے...... میں عام آدمی ہوتا تو ابھی خنجر نکال کر تیرا کام تمام کر دیتا...... مگر میں ایسا نہیں کروں گا...... اس فرزند صالح کی موت پر اب تک میں نے جس صبر کا دامن تھاما ہے، میں اب بھی اسی پر قائم رہوں گا...... اور تیری سزا یہی ہے کہ تو زندہ رہ اور اذیت و کرب کے ان صدموں کو اپنے دل پر سہہ، اب رات دن تڑپ تڑپ کر موت کا انتظار کرنا ہی تیری سزا ہے...... اب تو میری نظروں سے دور ہو جا۔''

☆......☆......☆

سورج کی نارنجی کرنوں میں اجین کے بت خانے کے اونچے کلس کو جن پر پیتل منڈھا ہوا تھا، چمک رہے تھے۔

اجین کا یہ مندر مثل سومنات تھا۔ یہ تین سو برس کے عرصے میں تعمیر ہوا تھا اور کسی قلعے کی طرح مستحکم تھا، اس کی دیواروں کی بلندی سو گز تھی، اس کے اندر راجہ بکرماجیت کی ایک بہت بڑی پتھر کی مورتی رکھی تھی، اس کے اطراف تانبے اور پیتل کی بنی بے شمار مورتیاں نصب تھیں۔

یہ بت خانہ ہندوؤں کی سازشی کارروائیوں کا مرکز اور بغاوت کا دفتر تھا۔ 1231ء میں سلطان التمش نے گوالیار پر حملہ کیا تھا، وہاں کے راجہ منگل دیو نے پورے ایک سال تک اس کا مقابلہ کیا بالآخر طویل محاصرے کے بعد اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ گوالیار کی تسخیر کے دو سال بعد التمش نے مالوہ پر بھی چڑھائی کی اور وہاں پر اول بھلسہ کو فتح کیا اور اب اس کا نشانہ ''اجین'' تھا۔

اجین کا بلند و بالا مندر ''مہ کال'' اس کی طاقت و جرأت کو للکار رہا تھا، سو اس نے مندر کی سو گز اونچی دیواروں کی بنیاد کھودنے کا حکم دیا۔

پھر فوج لے کر پوری طاقت کے ساتھ ہلہ بول دیا۔ اجین فتح ہوا، اس ''مہ کال'' مندر سے بکرماجیت کا بت اور دیگر مورتیاں دہلی بھجوا دیں جہاں جامع مسجد کے دروازے کے سامنے زمین کھود کر ان مورتیوں کو دفنا دیا گیا تاکہ نمازیوں کے قدموں تلے تا قیامت روندی جاتی رہیں۔

☆......☆......☆

چلچلاتی دوپہر، سہ پہر کی آغوش میں پڑی ہانپ رہی تھی۔ ہوا کے گرم تھپیڑوں میں ایک عجب سی افسردگی رچی ہوئی تھی، گو کہ دریچوں پر خس کی ٹٹی باندھ کر سرد پانی چھڑک دیا گیا تھا، خس کی ٹٹی سے گزر کر ہوا کے جھونکے کمرے میں داخل ہوتے تو کسی قدر ٹھنڈک کا احساس لئے ہوئے ہوتے، چھت کی لوہے کی کڑی سے بندھا جھالر دار کپڑے کا لیوترا پنکھا ایک کنیز مسلسل ہلا رہی تھی جبکہ دو کنیزیں ہاتھ میں بڑے مور چھل تھامے تیزی سے ہوا کر رہی تھیں اس کے باوجود بستر پر دراز ماہ نور بانو کی بے چینی میں کسی طور کمی نہ آئی تھی۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ صاحب فراش تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ جواں سال بیٹے ناصر الدین کی موت نے اسے بھی جیتے جی مار دیا تھا۔ تب سے ہی اس کی طبیعت نرم گرم چل رہی تھی۔ پچھلے ہفتے سے اس نے ایک دم پلنگ پکڑ لیا تھا۔ دلی کے سارے معروف طبیب اس کے علاج معالجے میں مصروف کار تھے مگر...... اس کا مرض تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

اس وقت اس کی مسہری کے قریب رضیہ بیگم اور شمسی موجود تھیں۔

''رضیہ!'' ماہ نور نے بے تاب لہجے میں بیٹی کو پکارا۔

''امی جان!'' رضیہ اس کی عرق آلود پیشانی پر پیار بھرے انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''آپ ٹھیک ہو جائیں گی...... حکیم صاحب کہہ رہے تھے فقط گرم ہوا کا اثر ہے...... جلد ہی یہ زائل ہو جائے گا۔''

''مجھے اب اپنی بیماری کی چنداں فکر نہیں۔'' ماہ نور نے دھیمے اور تھکن سے چور لہجے میں کہا۔ ''بس تم سب کی فکر ہے...... رضیہ! تم بڑی ہو، اپنے چھوٹے بھائیوں کا خیال رکھنا۔'' پھر وہ شمسی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''جی ملکہ عالیہ......!'' گو کہ التمش نے شمسی سے عقد کر لیا تھا مگر شمسی، ملکہ ماہ نور سے ہمیشہ ہی بے حد عزت و احترام سے پیش آتی تھی اور مثل ایک کنیز کے اسے ہمیشہ ملکہ عالیہ کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔

''شمسی! قطب الدین ابھی چھوٹا ہے۔'' ماہ نور نے دھیمے اور کمزور لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''دیکھا جائے تو اسے تم ہی نے پالا ہے...... وہ تم سے مانوس بھی بے حد ہے...... میرے بعد اس کا خیال رکھنا اور ناصر الدین محمود کے ساتھ اس کے ساتھ بھی التفات سے پیش آنا۔''

''ملکۂ عالیہ!'' شمسی نے تڑپ کر کہا۔ ''آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟ قطب الدین، ناصر الدین سے بڑے ہیں اور وہ ہمیشہ بڑے ہی رہیں گے...... میں ہمیشہ کی طرح آئندہ بھی ان کی نگہداشت کرتی رہوں گی۔''

''تم سے مجھے یہی توقع تھی۔'' ماہ نور نے شمسی کا نرم ہاتھ اپنے سرد اور پسینے سے شرابور ہاتھ میں تھام لیا۔ ''تم بہت اچھی ہو شمسی...... خدا تمہیں آباد رکھے۔''

اتنا زیادہ بول لینے کی وجہ سے ماہ نور بانو کی سانس ٹوٹنے لگی تھی۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں بند کر کے گہرے گہرے سانس لینے لگی تھی۔

''رضیہ......!'' چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے رضیہ کو آواز دی تھی۔ ''ذرا کسی کو بھیج کر سلطان معظم کو بلوا لو...... میں آخری بار ان سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''خدارا...... امی جان! ایسی باتیں نہ کریں۔'' رضیہ نے ملتجی لہجے میں کہا اور اشارے سے ایک کنیز کو سلطان کو بلانے کے لئے بھیجا۔

سلطان عصر کی نماز کے بعد مصلی پر بیٹھا اپنی چہیتی بیوی کی صحت کے لئے ہی دعا کر رہا تھا۔ خادمہ نے آ کر اسے خبر دی کہ ماہ نور بانو اس سے ملنے کی متمنی ہے، وہ مصلی سمیٹ کر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''ماہ نور بانو بیگم!'' التمش نے ماہ نور بانو کی سرد پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے دھیمے اور نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''سلطان معظم!'' ماہ نور بانو نے پیاسی نگاہیں کھولیں۔ ''میں خوش نصیب تھی کہ مجھے آپ کی رفاقت و سنگت نصیب ہوئی...... اب رفاقت کا یہ دور اختتام پذیر ہوتا ہے، مجھ سے کوئی خطا یا لغزش ہوئی ہو تو معاف فرمائیے گا...... اب یہ میرا سفر آخر ہے۔''

''کیا کہتی ہو ماہ نور بیگم!'' التمش نے تڑپ کر کہا۔ ''تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔''

''نہیں سرتاج! اب میں اس دار فانی سے کوچ کرنا چاہتی ہوں۔'' ماہ نور نے زیر لب کہا۔ ''وہاں میرا لخت جگر تنہا ہے...... میں اس کے پاس جانا چاہتی ہوں۔''

''کوئی ہے، ذرا حکیم صاحب کو تو بلائیے۔'' التمش نے بلند آواز میں حکم دیا۔

شہر بھر کے قابل ترین طبیب پل بھر میں حاضر ہو گئے۔ پر مرض الموت کا علاج کسی کے پاس نہ تھا۔ آخر کار نصف شب کے قریب ماہ نور بانو نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔

اس کی خواہش کے مطابق اس کی نماز جنازہ حضرت بختیار کاکیؒ نے پڑھائی۔ ماہ نور جیسی چاہنے والی، نیک اور دیندار شریک حیات کی موت نے التمش کے دل کے زخموں میں ایک اور کاری زخم کا اضافہ کر دیا تھا۔

اب وہ اپنا زیادہ وقت حضرت بختیار کاکیؒ کی خدمت میں گزارتا تھا۔ اس نے لاہور کی گورنری رکن الدین فیروز کو سونپی تھی مگر وہ اس عہدے سے پوری طرح عہدہ برآ نہ ہو سکا تھا۔ بجائے امور سلطنت و مسائل حکومت پر توجہ دینے کے وہ عیش و نشاط میں مبتلا ہو گیا تھا اور رات دن شراب کے سرور میں ڈوبا رہتا۔

التمش کے پاس اس کی شکایات پہنچ رہی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ اس نے گوالیار کی مہم پر جانے سے پہلے رضیہ کو امور حکومت کا نگراں مقرر کیا تھا۔ ناصر الدین محمود کے بعد رضیہ اس کی سب سے بڑی اولاد تھی اور وہ اس کی قابلیت اور لیاقت پر بھروسہ کرتا تھا۔ لڑکی ہونے کے باوجود اس میں مردوں کی سی بہادری، جرأت اور فکر و شعور کی چمک تھی۔

رضیہ نے باپ کی غیر حاضری میں حکومت کے گرانبار فرائض کو بہت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ اس نے اپنے عمدہ نظم و نسق، حسن اخلاق اور باوقار کردار کی مدد سے ماسوائے چند متعصب امرائے دربار کے جو عورت کی حکومت کے معترض تھے، ہر خاص و عام کو اپنی انتظامی صلاحیتوں کا معترف کر لیا تھا۔ التمش گوالیار کی مہم سے واپس لوٹنے پر رضیہ کے حسن انتظام کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

ماہ نور بانو کے انتقال کے بعد التمش خود کو بے حد تنہا اور کمزور محسوس کرنے لگا تھا اور اب جلد از جلد حکومت کے لئے کسی جانشین کا اعلان کر دینا چاہتا تھا۔ یہی سوچ لے کر وہ اس شام حضرت بختیار کاکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

''بہت متفکر نظر آ رہے ہو؟'' حضرت بختیارؒ نے اس کے اداس اور وحشت زدہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی......!'' التمش نے مودبانہ انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں حکومت کے آئندہ حکمراں کی طرف سے فکر مند ہوں، ناصر الدین محمود کی جواں مرگی اور رکن الدین فیروز کی نالائقی نے مجھے اس فکر و تردد میں مبتلا کر دیا ہے...... اپنے موجودہ بیٹوں میں سے میں کسی کو بھی تاجدار ہند بننے کا اہل نہیں پاتا۔''

''تمہارے ذہن میں جانشین کے لئے جو نام ہے، اس کے اظہار سے کیوں کترا رہے ہو؟'' حضرت نے ہلکے تبسم سے فرمایا۔

''وہ...... در اصل...... میرے ذہن میں رضیہ بیگم کا نام ہے۔'' التمش نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں میرے گوالیار کی مہم پر جانے کے بعد رضیہ نے حکومت کا نظم و نسق جس عمدگی سے چلایا، وہ اس کی قائدانہ صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔''

''جانتا ہوں۔'' حضرت نے آنکھیں بند کر کے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تم جو بہتر سمجھتے ہو، میرے خیال میں وہی بہتر ہے۔''

''یعنی آپ بھی اس بات کے حق میں ہیں کہ میں رضیہ کو ولی عہد نامزد کر دوں؟'' التمش نے پر جوش لہجے میں پوچھا۔

''اس کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے؟'' حضرت نے جواب دیا اور کلام اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

التمش نے بختیار کاکیؒ کے آستانے سے واپس آ کر تاج الملوک محمود دبیر سلطنت کو حکم دیا کہ رضیہ بیگم کو جانشین نامزد کر کے اس کی جانشینی کا اعلان کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چاندی کے سکے جاری کروائے جن پر التمش کے نام کے ساتھ رضیہ کا نام بھی تھا۔

بعض امراء جن کی نگاہوں میں، رضیہ کی سب سے بڑی کمزوری اس کی صنف سے عیاں تھی، منصب شاہی کو اس سے یوں منسوب ہوتے دیکھ کر احساس کمتری کے باعث جھلا اٹھے اور چند امراء، التمش کے وزیر نظام الملک کمال الدین جنیدی کی سرکردگی میں سلطان سے صاف صاف کہہ دیا۔ ''مسلمان بادشاہ کے لئے یہ مناسب اور موزوں نہیں کہ وہ اپنے لائق بیٹوں کے ہوتے ہوئے لڑکی کو ولی عہد مقرر کرے۔''

التمش نے مایوس نظروں سے امرائے دربار کی طرف دیکھا اور ایک آہ سرد کے ساتھ بولا۔ ''نادانو! اگر لڑکے لائق ہوتے تو غم کیا تھا لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ وہ نالائق ہیں اور نالائقی نے ان کی زندگی کو ناکارہ بنا رکھا ہے...... ان کے بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں کہ سرحدوں کی حفاظت کر سکیں اور ان کے شعور و ذہن میں اتنی پختگی نہیں کہ امور سلطنت کے بار گراں کو اٹھا سکیں، رضیہ لڑکی سہی مگر مردوں کی سی جرأت اور ذہانت کی مالک ہے، وہ اپنے نااہل بھائیوں سے بدرجہ بہتر ہے۔''

رضیہ کے جانشین مقرر کر دینے پر سب سے زیادہ چراغ پا شاہ ترخان تھی۔ وہ تخت و تاج اپنے بیٹے رکن الدین فیروز کا حق سمجھتی تھی، سو وہ اب اس کوشش میں لگ گئی تھی کہ سلطان کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر سکے۔ رضیہ کی جانشینی کے مخالف امراء بھی شاہ ترخان کے ہم نوا بن گئے تھے۔

اس شام التمش اپنی نشست گاہ میں بیٹھا کچھ سرکاری کاغذات کی جانچ پرکھ میں مصروف تھا کہ شاہ ترخان چاندی کی ایک طشتری میں ٹھنڈا اور شیریں مشروب ''شیر شیریں'' لئے آ موجود ہوئی۔

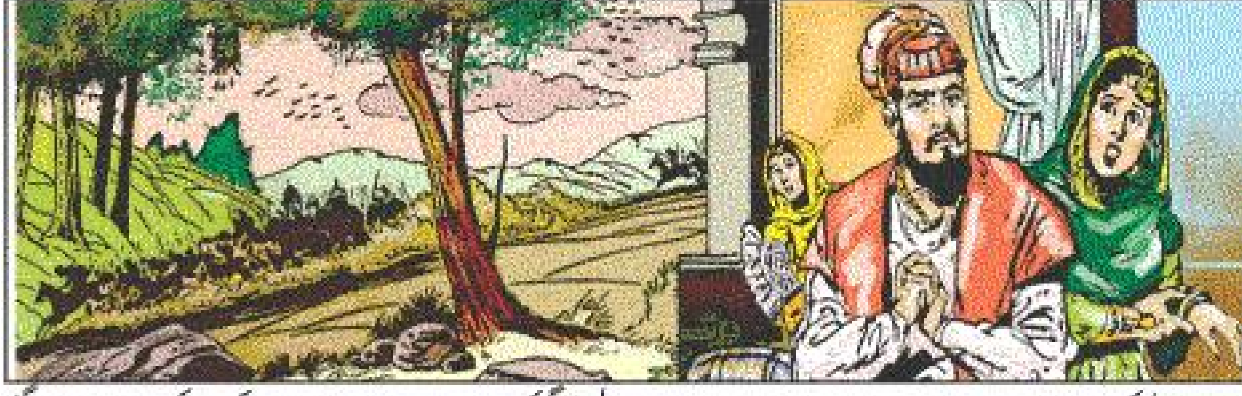
یہ مشروب ماہ نور بانو کو بھی بے حد مرغوب تھا اور اسی کی وجہ سے التمش بھی اسے شوق سے نوش جان کرتا تھا۔ شاہ ترخان کے مشروب لانے پر اس کے لبوں پر تشکر آمیز مسکراہٹ بکھر گئی۔

صفحہ نمبر:......2

''شکریہ شاہ ترخان بیگم!'' اس نے مشکور لہجے میں کہتے ہوئے گلاس تھام لیا۔

''میں آپ سے ایک گزارش کرنا چاہتی تھی۔'' شاہ ترخان اس کے سامنے رکھے کوچ پر ٹکتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

''ہاں بولو...... کیا بات ہے؟'' التمش نے مشروب کی چسکی لیتے



ہوئے سوال کیا۔

''تمام امراء کو رضیہ کے جانشین مقرر کیے جانے پر اعتراض اور خفگی ہے...... اگر آپ اس سلسلے میں اپنے پیرو مرشد حضرت بختیارؒ سے مشورہ کر لیتے تو......!''

''میں نے انہی کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا ہے۔'' التمش نے گلاس سامنے دھری تپائی پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''دین اسلام میں کہیں ایسی کوئی ممانعت اور رکاوٹ نہیں ہے کہ کوئی عورت حکمران نہیں بن سکتی۔''

''وہ تو ہے۔'' شاہ ترخان نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''پر ذرا سوچئے اس طرح رکن الدین فیروز کا حق مارا جائے گا۔''

''اگر وہ اس قابل ہوتا تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا۔'' التمش نے افسردہ اور دلگرفتہ لہجے میں جواب دیا۔ ''لاہور میں وہ جو کچھ کر رہا ہے، وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں۔''

''تو آپ اسے لاہور سے بلا کر اپنے پاس کیوں نہیں رکھتے، آپ کی صحبت میں رہے گا تو یقیناً اس میں بہتری کے آثار پیدا ہوں گے۔''

شاہ ترخان کے مشورے پر سلطان سوچ میں ڈوب گیا۔ گو کہ وہ رکن الدین سے کچھ زیادہ پرامید نہ تھا، اس کے باوجود اس نے ایک اور کوشش کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اگلے ہی دن اس نے رکن الدین کو لاہور سے دہلی بلا بھیجا۔

اپنی اس کامیابی پر شاہ ترخان بے حد خوش تھی جبکہ شمسی افسردہ تھی۔ وہ جانتی تھی، دہلی کے تخت و تاج کو سنبھالنے کے لئے سلطان کی اولادوں میں اس وقت صرف رضیہ ہی اہل اور قابل تھی مگر وہ اپنے ان خیالات کو سلطان تک پہنچانے سے قاصر تھی، کیونکہ ماہ نور بانو کی وفات کے بعد سے شاہ ترخان، سلطان کے مزاج میں کچھ زیادہ ہی دخیل ہو گئی تھی، وہ اپنا زیادہ وقت سلطان کے آس پاس ہی گزارتی تھی، شمسی کو تو شاذ و نادر ہی سلطان کے قریب جانے کا موقع ملتا تھا، وہ اپنا زیادہ وقت قطب الدین اور ناصر الدین محمود کی تعلیم و تربیت اور دیکھ بھال میں صرف کرتی تھی۔

☆......☆......☆

شام اپنا سرمئی آنچل دھیرے دھیرے کائنات پر پھیلاتی جا رہی تھی۔ شام کے پھیلتے سایوں میں ایک عجب سا کرب رچا ہوا تھا، شام کی نرم ہوا کے سبک خرام جھونکوں میں ایک بے نام سی مایوسی اور محرومی بسی ہوئی تھی۔ ریت اڑاتے کچے راستوں پر چلتا سلطان کا شاہی قافلہ ایک عجب سی سوگواری کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا، اونٹ، گھوڑے اور ہاتھی سب ہی خاموشی سے اپنی دمیں ہلاتے آگے بڑھ رہے تھے، بعض گھوڑوں اور ہاتھیوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیاں ان کے چلنے پر بجتیں تو ماحول کا سکوت کسی قدر ٹوٹتا محسوس ہوتا۔

سلطان الہند خان سکندر منش شمس الدین التمش اس چھوٹے سے شاہی قافلے میں اپنی سرحدوں کے سالانہ دورے پر نکلا ہوا تھا۔ اس کی سلطنت کی حدود کافی وسیع تھیں، کوہ ہمالیہ سے بندھیاچل اور دریائے اٹک سے برہم پتر کے تمام علاقے اس نے فتح کر لئے تھے۔

اس وقت وہ وسط ایشیا کے سرحدی کنارے سے گزر رہا تھا۔ وہ اپنے پسندیدہ سفید ہاتھی کے ہودے میں مخملیں گدی پر پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہودے کے پردے سمٹے ہوئے تھے، وہ دریچے سے باہر دور تک پھیلے میدانوں، کہیں کہیں موجود گھنے پیڑوں اور چراگاہوں کا نظارہ کر رہا تھا، اس کا دل ایک عجب سی بے چینی کے گرداب میں گھرا ہوا تھا۔

اچانک ہی قافلہ ایک چھوٹے سے قصبے میں داخل ہوا تھا۔ کچھ گزرگاہ کے اس پار ایک نیم پختہ مدرسے کی عمارت تھی اور اس کے سامنے کی جانب ذرا فاصلے پر ایک خستہ حال حویلی تھی، حویلی کی دوسری جانب قصبے کا بازار اور آبادی تھی۔

التمش چونک کر سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ یہ نیم پختہ راستہ، یہ مدرسہ، یہ حویلی...... یہ علاقے یہ سب کچھ تو جانا پہچانا اور مانوس سا لگ رہا تھا۔

''محمد جنیدی'' اس نے اپنے ساتھ ساتھ گھوڑے پر سوار محوِ سفر اپنے وزیر باتدبیر کو مخاطب کیا۔

''سلطان معظم!'' محمد جنیدی لحظہ بھر میں اس کے ہاتھی کے ہودے کے قریب آٹھہرا تھا۔

''محمد جنیدی! ذرا معلوم کرو کہ یہ کون سا علاقہ ہے۔'' التمش نے بے تاب لہجے میں حکم دیا۔ ''اور قافلے کو سست رفتاری کا حکم دے دو۔''

''جو حکم سلطان معظم!'' محمد جنیدی نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے جواب دیا۔

قافلے کی رفتار تھم سی گئی۔ کچھ ہی دیر میں بھیجے گئے کارندے نے آکر اطلاع دی تھی۔ ''یہ ترکی النسل البری قبیلے کا علاقہ ہے۔''

''البری قبیلہ......!'' التمش نے دھڑکتے دل سے دہرایا اور پھر قافلے کو پڑاؤ کا حکم دے دیا تھا۔ ''ہم آج شب یہیں بسر کریں گے۔''

سلطان کا حکم ہوتے ہی، جانوروں کو، کہ جن کی رفتار پہلے ہی نہ ہونے کے برابر تھی، فوراً روک دیا گیا، خیمے نصب کیے جانے لگے اور شاہی باورچی رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

تب ہی سامنے واقع مدرسے سے ملحقہ مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز بلند ہوئی تھی۔ التمش، محمد جنیدی اور دیگر لوگوں کے ہمراہ نماز مغرب کی ادائیگی کے لئے مسجد کی جانب چل دیا۔ یہ راستہ، یہ مدرسہ، یہ مسجد یہ سب کچھ کتنے جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔ التمش کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ یہاں پہلے بھی آ چکا ہے...... یہ سب کچھ اسے بے حد مانوس اور اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔ حویلی کے سامنے سے گزرتے سمے اس کے قدم آپ ہی آپ ساکت ہو گئے تھے۔

''محمد جنیدی! معلوم کرو کہ حویلی کس کی ہے؟''

کچھ ہی دیر میں حویلی کا مالک ادھیڑ عمر موذن خان، التمش کی خدمت میں آ حاضر ہوا۔

''یہ حویلی آپ کی ہے؟'' التمش نے بے قرار لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں سلطان معظم!'' حویلی کے ادھیڑ عمر ترکمان مالک، موذن خان نے مؤدب اور مہذب لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ حویلی میرے چچا کی ملکیت تھی، ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹوں نے ساری جائداد مٹی میں ملا دی اور یہ آبائی حویلی بھی اونے پونے فروخت کر دی، جب میں بڑا ہوا تو میں نے یہ حویلی خرید لی۔''

''اوہ......!'' التمش نے بغور موذن خان کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''تیرے چچا کا کیا نام تھا؟''

''سلطان معظم! میرے چچا البری قبیلے کے سردار تھے...... ان کا نام ایلم خان تھا۔''

''ایلم خان......!'' التمش کو اپنے دل کی دھڑکنیں تھمتی محسوس ہوئیں۔ لاشعور میں خوابیدہ یادوں کی پرچھائیاں سبک خرامی سے شعور کی جانب محوِ سفر تھیں، بھولی بسری یادوں کے مٹے مٹے سے نقوش ذہن کے پردے پر ابھرتے جا رہے تھے۔

''ایلم خان...... ایلم خان......!'' دل کی پرشور بے ہنگم دھڑکنوں نے اس نام کی گردان کے ساتھ اسے یاد دلایا تھا کہ نام سنا ہوا ہی نہیں بلکہ بے حد مانوس ہے...... بے حد اپنا اپنا سا...... اور تب ہی بالکل اچانک اس کی روح تک تڑپ اٹھی تھی۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ یہ راستے، یہ مدرسہ، وہ حویلی اور البری قبیلے کا ترکمان سردار ایلم خان......!

''اب...... اب کہاں ہیں ایلم خان......؟'' التمش نے لرزتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''میں نے عرض کیا نا سلطان معظم کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔'' موذن خان نے سر جھکا کر افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ''دراصل ایک صدمہ ان کی موت کا سبب بن گیا اور وہ جواں عمری میں ہی اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔''

''کیسا صدمہ......؟'' التمش نے دلگیر آواز میں سوال کیا۔

''وہ اپنے چھوٹے بیٹے شمس الدین سے بے پناہ الفت رکھتے تھے مگر ان کی پہلی بیوی کے بیٹوں ضغیم خان اور معز الدین نے اس بچے کو کمسنی میں ہی کسی قافلے کے ہاتھوں فروخت کر دیا...... ایلم خان کو علم ہوا تو وہ دیوانہ وار اس کی تلاش میں نکلا، مہینوں اسے ڈھونڈتا رہا مگر وہ اپنے اس لخت جگر کو دوبارہ نہ پا سکا، مایوسی بیماری بن کر اس کی روح پر مسلط ہو گئی تھی، عزیز از جان بیٹے کی جدائی گھن کی طرح اسے چاٹ گئی اور بیٹے کی گمشدگی کے چھ ماہ بعد ہی وہ ملک عدم کو سدھار گیا۔

''اِنّا لِلّٰہ......!'' التمش نے سسکتے ہوئے لہجے میں کہا اور کئی لمحوں تک اپنے تڑپتے ہوئے دل کو سنبھالنے کی کوشش میں لگا رہا۔

''اور...... اور...... ان کی دوسری بیوی؟'' کافی دیر بعد از سر نو ہمت مجتمع کر کے اس نے دھڑکتے لہجے میں سوال کیا۔

''ان کی دوسری بیوی حناشا خانم، ایک نیک اور خدا رسیدہ بی بی تھی، بیٹے کی گمشدگی اور شوہر کی وفات کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی، ایسے میں اس کی سوت ورقہ بانو اور سوتیلے بیٹوں ضغیم خان اور معز الدین نے اس پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی اور آخر کار گھر سے نکال باہر کیا، وہ نیک اور مظلوم بی بی اپنے والد کی قبر جو کہ جنگل میں واقع تھی، چلی گئی، اپنی زندگی کے بقیہ دن اس نے وہیں عبادت میں گزارے اور بعد از مرگ وہیں اپنے صوفی منش باپ کے پہلو میں دفن ہوئی۔''

''اف......!'' شدت کرب سے التمش نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے اپنے کانوں میں حناشا خانم کی مشفق اور مترنم آواز گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔

دولت اور جائداد ہاتھ لگتے ہی ضغیم خان اور معز الدین اپنے آپے سے باہر ہو گئے تھے اور عیش و عشرت اور لہو و لعب میں رات دن باپ کی محنت کی کمائی لٹانے لگے۔ ورقہ بانو نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ماں سے بھی بدتمیزی پر اتر آتے حتیٰ کہ اس پر ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز نہ کرتے...... یہ سب کچھ برداشت کرتے اور رات دن سسکتے، آخر ایک دن وہ بھی پیوند زمین ہو گئی، ماں کی موت کے بعد وہ دونوں کچھ اور خود مختار ہو گئے اور باپ کی برسوں کی کمائی ہوئی دولت انہوں نے چند ہی مہینوں میں ٹھکانے لگا دی حتیٰ کہ یہ حویلی بیچنے کی نوبت آ گئی...... حویلی کی قیمت کے حصول پر دونوں بھائیوں کے مابین ٹھن گئی، آخر غصے میں چھوٹے بھائی معز الدین نے ضغیم خان کو خنجر کے وار سے زخمی کر دیا اور زخموں کی تاب نہ لا کر وہ چل بسا، ضغیم خان کے خسر جو اس کا سگا ماموں بھی تھا، جوش انتقام میں اندھا ہو گیا اور اس نے معز الدین کو قتل کر دیا اور یوں یہ کہانی اختتام کو پہنچی۔''

موذن خان کے خاموش ہو جانے پر ماحول پر طاری سکوت کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ ہر شے ساکت اور خاموش تھی۔

''موذن خان! کیا تم جنگل میں اس جگہ سے واقف ہو، جہاں سردار ایلم خان کی دوسری بیوی اور اس کے باپ کی قبریں ہیں؟'' کافی دیر بعد التمش کی سسکتی ہوئی آواز ابھری تھی۔

''جی سلطان معظم!'' موذن خان نے مستعد لہجے میں جواب دیا۔

جنگل کے ایک پرسکون گوشے میں گھاس پھوس سے بنی ایک چھوٹی سی کٹیا میں ایک قبر بنی ہوئی تھی، جس کے سرہانے ایک کتبہ لگا تھا، جس پر ''احمد الفویش'' لکھا ہوا تھا، اسی کے پہلو میں اس کی چہیتی اور اکلوتی بیٹی کی قبر تھی۔

شمس الدین التمش نے خضوع و خشوع سے تلاوت کلام پاک کے بعد فاتحہ خوانی کی اور دیر تک قبروں کے پاس بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔

موذن خان حیرت سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

''تم یہ سب دیکھ کر حیرت زدہ ہو موذن خان......؟'' خوب جی بھر کر آنسو بہا لینے کے بعد التمش نے موذن خان کی طرف دیکھتے ہوئے اشک بار آنکھوں اور گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''تمہاری آنکھوں سے سوال جھانک رہا ہے کہ بھلا ان قبروں میں سوئی ہوئی ان مطاہر ارواح سے میرا کیا رشتہ ہے؟ تو لو سنو...... یہ سامنے والی قبر جس پر احمد الفویش کے نام کی تختی آویزاں ہے، یہ میرے نانا کی قبر ہے اور اپنے نیک متقی باپ کے پہلو میں میری ماں حناشا خانم مدفون ہیں۔''

''آ...... آپ......؟'' موذن خان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کا سوال اس کے ہونٹوں پر لرز کر رہ گیا۔

''ہاں موذن خان......! میں وہی بدنصیب شمس الدین ہوں جس کو اس کے بھائیوں نے بخارا کے ایک سوداگر کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا، جس کے غم میں اس کا باپ ایلم خان بے موت مر گیا اور ماں نے زمانے کے ستم و ظلم سہہ کر اس مشیت غبار میں منہ چھپا لیا۔''

''بھائی شمس الدین!'' اس کے چچا زاد بھائی موذن خان نے بے ساختہ بازو پھیلا دیئے تھے۔ شمس الدین اس کے بازوؤں میں سما گیا اور کسی کمسن بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

خود موذن خان بھی زار و قطار رو رہا تھا۔

شمس الدین التمش نے اپنے برباد خاندان کی اس واحد نشانی یعنی اپنے اس اکلوتے چچیرے بھائی موذن کے ساتھ نہایت محبت اور عنایت کا سلوک کیا اور اس علاقے کی تمام جاگیر اس کے نام کر کے البری قبیلے کی سرداری بھی اسے بخش دی اور واپسی کے لئے روانہ ہو گیا۔

دہلی پہنچتے ہی اسے خبر ملی کہ قطب الدین، بختیار کاکیؒ کی طبیعت خراب ہے۔ وہ الٹے پاؤں ان کے آستانے پر حاضر ہوا۔ بختیار کاکیؒ کی سانسیں اکھڑی ہوئی چل رہی تھیں۔

''حضرت......!'' التمش نے تڑپتے انداز میں ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی اتنی طبیعت ناساز تھی اور آپ نے مجھے اطلاع بھی نہیں کروائی؟''

''ہمیں پتا تھا کہ ہمارے رخصت ہونے سے قبل تم آ جاؤ گے۔'' حضرت بختیارؒ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''نہیں حضرت! ایسا مت کہئے، میں پہلے ہی بہت اکیلا ہوں...... اپنے کتنے ہی پیاروں کو رو چکا ہوں، آپ کی جدائی نہ سہہ سکوں گا۔''

''التمش......!'' حضرت بختیارؒ نے اپنا سرد اور لرزیدہ ہاتھ التمش کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ''یہ غم جدائی تو تمہیں سہنا ہی ہوگا۔''

''محمد جنیدی......!'' التمش نے پلٹ کر دروازے میں ایستادہ اپنے وزیر کو پکارا۔ ''شہر کے نہیں بلکہ پوری سلطنت کے اعلیٰ ترین اطباء کو طلب کر لیا جائے...... ہم کسی بھی قیمت پر اپنے پیرو مرشد کو موت کی وادی میں اترنے نہ دیں گے۔''

''التمش......!'' حضرت بختیارؒ کے باریک خشک لبوں پر ہلکے تبسم کی لو ٹمٹمائی۔ ''کیسی اطفال کی سی باتیں کر رہے ہو، میرے عزیز! موت سے کے مفر ہے...... جو ماں کی گود میں آیا، آخر کار اسے گور کی آغوش میں جانا ہے...... یہی قانونِ فطرت ہے اور فیصلۂ قدرت بھی......!''

''مگر حضرت......!'' التمش کی آواز بھرا گئی۔ ''آپ کے بعد میرا کون ہوگا؟''

''اللہ ہی سب کا ولی اور مونس ہے۔'' حضرت بختیارؒ نے رک رک کر جواب دیا۔ وہ حی القیوم ہے باقی ہر شے فنا کی آغوش میں سمٹنے کے لئے وجود میں آئی ہے...... صرف اس پاک پروردگار کی ذات لافانی اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہے...... تیرے لئے وہی کافی ہے...... بے شک وہ بہترین کارساز ہے۔''

کلمۂ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے حضرت بختیارؒ نے جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

قاضی حمید الدین ناگوری ان دنوں حضرت کی خدمت میں حاضر تھے۔ ان کی ایماء پر اور اپنی دلی خواہش پر التمش نے کنویں سے پانی نکال کر اپنے پیرو مرشد کو اپنے ہاتھوں سے غسل آخر دیا اور لباس آخر میں ملبوس کر کے جنازہ تیار کیا۔

نماز جنازہ کے لئے جنازے کو جامع مسجد میں لایا گیا تو لاکھوں معتقدین جنازے کے ساتھ تھے۔ لوگوں کو توقع تھی کہ حضرت قاضی ناگوری نماز جنازہ پڑھائیں گے۔ لوگوں کے کہنے پر قاضی صاحب نے جواب دیا۔ ''اگر یہ سعادت مجھے نصیب ہو سکتی تو میں خود کو خوش قسمت تصور کرتا مگر اس سلسلے میں حضرت کی ایک وصیت ہے، اس سے روگردانی کسی طور جائز نہیں۔''

پھر انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی وصیت کا اعلان کیا۔

''خواجہ بختیارؒ نے وفات سے ایک روز قبل اس ضمن میں یہ فرمایا تھا کہ میری نماز جنازہ جو شخص پڑھائے گا، اس میں یہ اوصاف ہونے چاہئیں، اول یہ کہ اس نے کسی نامحرم کو ہاتھ نہ لگایا ہو، کسی غیر عورت کو نگاہ بھر کر نہ دیکھا ہو، دوم یہ کہ اس نے کبھی بے وضو آسمان کو نہ دیکھا ہو، سوم یہ کہ اس نے عصر کی سنتیں اور تکبیر اولیٰ نہ چھوڑی ہو اور ہمیشہ تہجد گزار رہا ہو اور چہارم یہ کہ اس نے فرض نماز ہمیشہ باجماعت پڑھی ہو۔'' حضرت کے فرمان کے اعلان کے بعد قاضی حمید الدین سامنے کی صف میں جا کر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ جنازے پر لاکھوں عقیدت مند حاضر تھے لیکن ان میں سے ایک بھی حضرت کی وصیت کی کسوٹی پر پورا نہ اترتا تھا، اسی لئے لاکھوں کا مجمع ہونے کے باوجود کوئی بھی نماز جنازہ کی امامت کے لئے آگے نہ بڑھا۔

بالآخر سلطان الہند شمس الدین التمش بہ چشم نم اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس پل اس کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔

''امروز! پیش خلق، میرا راز...... رسوا کر دیا۔'' اس کی اس فریاد پردہ دری اور پُر رقت انداز کو دیکھ کر لوگوں پر رقت طاری ہو گئی۔

☆......☆......☆

سیوستان کا نیلگوں آکاش سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وقفے وقفے سے بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ سلطان التمش اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ ملتان کی طرف محوِ سفر تھا کہ اچانک اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ تیز بخار سے بدن انگارے کی طرح دہکنے لگا اور دماغ ضعف کا شکار ہو گیا تھا۔ عالم نیم غشی میں اعیانِ سلطنت اسے عماری میں ڈال کر دہلی لائے اور علاج معالجہ شروع ہوا۔ پر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق یہ مرض، مرض آخر ثابت ہوا اور 3 اپریل 1236ء کو 26 سالہ حکومت کے بعد سلطان الہند شمس الدین التمش اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔

☆......☆......☆

گو کہ التمش نے رضیہ بیگم کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا لیکن امراء کسی بھی طرح ایک عورت کی قیادت تسلیم کرنے کو آمادہ نہ تھے، چنانچہ انہوں نے التمش کی وصیت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے بیٹے رکن الدین فیروز کو مسند حکومت پر بٹھا دیا۔

رکن الدین ایک نااہل ناقص العقل اور بے شعور شخص تھا۔ وہ شروع سے ہی عیش و طرب کا دلدادہ تھا۔ حکومت کی باگ ڈور ہاتھ آتے ہی وہ آپے سے باہر ہو گیا اور پوری طرح لہو و لعب میں غرق ہو گیا، دربار شاہی عیش و نشاط کا گڑھ بن گیا اور قصر شاہی دہلی کی بیواؤں کا ٹھکانہ...... خزانہ حکومت مسخروں، بھانڈوں، گویوں اور طوائفوں کی نذر ہونے لگا۔

وہ رات دن شراب کے نشے میں دھت شباب کی آغوش میں انٹا غفیل پڑا رہتا اور یوں حکومت کے سارے اختیارات اس کی ماں شاہ ترخان کے ہاتھ میں آ گئے تھے۔

وہ ایک بے شعور اور منتقم مزاج عورت تھی۔ عنان حکومت ہاتھ میں آتے ہی وہ کنیز زادی اپنی اوقات بھول گئی...... اس نے التمش کی تین بیگمات کو جو اعلیٰ خاندان کی پروردہ تھیں، قتل کروا دیا، اس کے انتقام کا اصل نشانہ شمسی تھی، کہ جس نے اس کی غلامی سے فرار اختیار کر کے التمش کی پناہ اور زوجیت اختیار کی تھی۔ سو اس نے شمسی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا اور ظلم و بربریت کی انتہا کر دی، اس کے جسم کو دہکتے آہن سے داغا جاتا اور زنبور سے اس کے ناخن کھینچ دیئے گئے، اس کی کھال اس کے گوشت سے جدا کر دی گئی اور یوں تشدد و بربریت کا شکار ہو کر آخر کار وہ اس جہان سے کوچ کر گئی۔

شمسی کے بعد اس نے ماہ نور بانو کے چہیتے بیٹے قطب الدین کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا تھا اور اس شہزادے کی آنکھیں دہکتی ہوئی سلاخوں سے جلا دی گئی تھیں، اندھا کر کے اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا، جہاں سسک سسک کر آخر کار اس نے دم دے دیا۔

پھر اس نے شمسی کے بیٹے جس کا نام سلطان نے اپنے بڑے بیٹے ناصر الدین محمود کے نام پر رکھا تھا، کی طرف توجہ کی اور اسے گرفتار کر کے اندھے کنویں میں ڈلوا دیا۔

اس کے بعد اب اس کے انتقام کا نشانہ رضیہ تھی۔ اب وہ رضیہ کو راستے سے ہٹانا چاہتی تھی مگر رضیہ اس کے ارادوں کو بھانپ گئی اور جمعے کے روز جبکہ مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، رضیہ نے مظلوموں کا سیاہ لباس زیب تن کیا اور قصر شاہی کے ایک جھروکے میں جو مسجد کے صحن میں کھلتا تھا، آ کھڑی ہوئی اور نہایت ہی درد انگیز آواز میں لوگوں کو پکارتے ہوئے فریاد کناں ہوئی۔

''اے میرے والد مرحوم کے پرانے نمک خوارو! ظلم و ستم کی انتہا ہو گئی۔ سلطان کی تمام بیگمات بشمول شمسی بیگم کو عبرتناک موت مار دیا گیا۔ سارے شہزادوں کو قید و بند میں ڈال دیا گیا اور ماہ نور بانو بیگم کے چہیتے نور نظر کو آنکھیں نکلوا کر موت کی نیند سلا دیا گیا، کوئی دن جاتا ہے کہ اب میری باری آیا چاہتی ہے...... رکن الدین اور شاہ ترخان کی بے رحم حکومت عنقریب مجھے بھی اس حیات قید و بند سے نجات دلا دے گی۔''

رضیہ کی اس دل پذیر تقریر نے لوگوں کے دلوں پر ازحد اثر کیا اور لوگ ایک دم سے مشتعل ہو گئے۔ بڑے بڑے ارا کین حکومت اور فوجی افسر جنہوں نے تقریباً چھ ماہ بیشتر رکن الدین فیروز شاہ کو تخت نشین کروایا تھا، اب اس کا تختہ کرانے کی فکر میں لگ گئے۔ وہ سب رکن الدین اور اس کی ماں شاہ ترخان کی بدعنوانیوں، بدکاریوں اور ظلم و استبداد سے پہلے ہی بیزار تھے۔ رضیہ کے اس آتش بیانی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

چنانچہ اودھ، بدایوں، ملتان اور لاہور کے گورنروں نے متحدہ محاذ قائم کر کے شاہ ترخان اور رکن الدین کے خلاف دہلی کی طرف پیش قدمی کی۔ اس پر رکن الدین فوج لے کر دہلی سے باہر مقابلے کے لئے نکلا، مگر فوجیوں نے اس کا ساتھ نہ دیا چنانچہ رکن الدین اور شاہ ترخان کو گرفتار کر کے ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

ضوفشاں آفتاب کی دمکتی کرنوں میں قصر شاہی کے اونچے میناروں اور چوباروں کے کلس چمک رہے تھے۔ دربار شاہی کے اونچے محرابی دروں کے حریری پردے جو مرمر کے ستواں ستونوں کے ساتھ ریشمی ڈوریوں سے آویزاں تھے، ہوا کے نرم اور مدھر جھونکوں پر دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ دربار کے مرمریں فرش پر دبیز ایرانی مخملیں قالین بچھے تھے اور تمام امراء، وزراء دست بستہ نگاہ نیچی کئے، سر جھکائے مؤدب و مستعد کھڑے تھے، سامنے کی جانب نسبتاً اونچے چبوترے پر تخت شاہی دھرا تھا۔ دونوں جانب نیزہ بردار غلام چوکنا و مستعد کھڑے تھے اور تخت کے پیچھے نوخیز و دل آویز کنیزیں مور چھل ہلا رہی تھیں۔

اور تخت شاہی پر مردانہ لباس میں چہرے پر مہین نقاب ڈالے، رضیہ سلطانہ بنت شمس الدین التمش جلوہ گر تھی۔

اس کے حضور رکن الدین فیروز اور اس کی ماں شاہ ترخان کو پابہ زنجیر پیش کیا گیا۔ ان دونوں پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں اپنے چہیتے بھائی قطب الدین کی نور سے محروم آنکھیں اور بدترین موت کا منظر گھوم گیا تھا، اس نے ضبط کی انتہائی حدوں کو چھوتے ہوئے کرب بھرے لہجے میں حکم دیا تھا۔

''یہ قاتل ہیں، انہیں قتل کر دیا جائے۔''

☆......☆......☆

اور یوں البری ترکی قبیلے کے ترکمان سردار ایلم خان کا بیٹا جس نے ایک غلام کی حیثیت سے زندگی کی پرخار وادیوں میں قدم رکھا، آخر کار دہلی کے تخت عظیم پر سلطان کی حیثیت سے قدم رنجہ ہوا اور بعد از مرگ اپنی سلطنت اپنی عزیز از جان بیٹی رضیہ سلطانہ کے حوالے کر گیا۔ تاریخ بھی اس فرشتہ سیرت، بندۂ مومن، صالح اور صوفی کو نہ بھول سکے گی، جس نے بادشاہت میں فقیری کا دامن نہ چھوڑا تھا۔

(ختم شد)